

ان دیکھی دنیا

سر آرتھر کوئن ڈائل

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان دیوی دنیا

لڑکے اور لڑکیوں کے لیے
ایک دل چسپ ناول

سر آرٹھر کونن ڈائل

ترجمہ: سعید رضا سعید



نیشنل بک ٹرسٹ پاکستان

لاہور، راولپنڈی، منگلا، پشاور، حیدرآباد، کراچی

شرط یہ ہے کہ.....

مسٹر ہنگرٹن لندن کے ایک بہت بڑے بینک کے ڈائریکٹر تھے
 میں ان کی لڑکی، گیلڈی، سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ پر بہت
 نہرمان تھے اور میں ہفتے میں دو تین بار ضرور ان کے گھر جاتا تھا۔
 ایک دن میں مسٹر ہنگرٹن کے گھر گیا تو وہ سوٹ پہنے کھڑے
 تھے۔ معاذم ہوا کہ آج بینک کے ڈائریکٹروں کی میٹنگ ہے اور وہ
 وہیں جا رہے ہیں۔ انہوں نے دو چار منٹ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور
 پھر اٹھ کر چلے گئے۔

اگر میں ادیب یا شاعر ہوتا تو گیلڈی کی تعریف کا حق ادا کر سکتا
 لیکن بد قسمتی سے میں اخباری رپورٹر ہوں اس لیے اس سے زیادہ کچھ
 اس کہہ سکتا کہ وہ بہت خوب صورت اور نیک لڑکی تھی۔
 وہ ایک سٹریٹ پر دے کے پاس بیٹھی تھی۔ ہم دونوں بڑی دیر تک
 خاموش رہے۔ آخر اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا: آپ بہت اچھے
 آدمی ہیں۔ میرے ابا جان آپ کو پسند کرتے ہیں لیکن —



سعید رضا سعید

پہلی بار _____ 1969ء
 تعداد _____ 2000
 قیمت _____

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ - لاہور • باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

گلیڈی بولی: "میں نے ایک ایسے شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو کوئی بہت بڑا کارنامہ کرے۔ ایک ایسا کارنامہ جو اسے ساری دنیا میں مشہور کر دے۔"

گلیڈی کے یہ ارادے سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بولی: "آپ چاہے اسے میرا بچپنا کہیں یا پاگل پن۔ مگر ہے یہ حقیقت: اچھا، اگر مجھے موقع ملا تو۔"

موقع ملا نہیں کرتا۔ تلاش کیا جاتا ہے اور اب خدا حافظ۔ آپ کو دفتر جانا ہے۔"

میں باہر نکل کر پہلے تو آٹو کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر ٹرام میں بیٹھ کر اخبار ڈیلی گزٹ کے دفتر کی طرف چل دیا۔ اسی اخبار میں میں کام کرتا تھا۔

جیسے ہی میں دفتر میں داخل ہوا اخبار کے ایڈیٹر میکا رڈولڈ نے مجھے بلایا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا: "میں تمہارے کام سے خوش ہوں میلون۔ خاص کر کوئلے کی کان والے حادثے کی رپورٹ جاؤ گے نا۔ تو بہت اچھی تھی۔"

اسے خوش پا کر میں نے کہا: "جناب، آپ مجھ پر ایک غنا کریں۔"

"وہ کیا؟" اس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ مجھے کسی بڑے اہم کام پر بھیج دیں۔ کسی ایسی مہم پر جہاں کامیابی مشکل ہو۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

پیشن کر ایڈیٹر مسکرایا اور بولا: "میاں، وہ زمانے گئے جب اس قسم کی مہمیں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انسان کا قدم نہ پہنچ گیا ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ تم دیر میں پیدا ہوئے۔ ساری مہمیں پہلے ہی سر کر لی گئی ہیں۔"

پیشن کر باؤسی سے میرا منہ لٹک گیا۔ لیکن جب میں اٹھنے لگا تو اس نے کہا: "سنو۔۔۔" میں پھر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا۔ تمہیں مشکل کام کرنے کا شوق ہے تو انور پارک جاؤ اور مٹر چمچے پنجر کا انٹرویو لینے کی کوشش کرو۔"

میں نے پروفیسر چمچے پنجر کا نام سنا تھا۔ وہ ایک مشہور ماہر حیوانیات تھے اور بڑے بددماغ مشہور تھے۔ ایک اخبار کے رپورٹر کا تو انھوں نے سر ہی پھوڑ دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ایڈیٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"جی چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد ایڈیٹر نے ایک موٹے سے فائل میں سے پروفیسر چمچے پنجر کے بارے میں ضروری معلومات نکال کر مجھے دیں اور بولا: "بس یہی کام ہے، اس کو

کر دکھاؤ تو بہت ہے۔

میں کاغذات لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اُن پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ دو سال ہوئے پروفیسر جے پنجر تنہا جنوبی امریکہ کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر انہوں نے ایک پریس کانفرنس بلوائی اور اپنے واقعات سنانے لگے۔ کچھ رپورٹروں نے اُن سے کچھ سوالات کیے تو وہ چلے گئے اور اس کے بعد سے چپ سادھ لی۔ کئی رپورٹروں نے اُن کی زبان کھلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

دفتر سے نکل کر میں کافی پینے پر بس کلب چلا گیا۔ وہاں رسالہ پنجر کا ایک ایڈیٹر ہنری بیٹھا تھا۔ میں اسی کی میز پر جا بیٹھا اور باتوں باتوں میں پوچھا۔

یہ بتاؤ۔ یہ پروفیسر جے پنجر کیسے آدمی ہیں؟

ہنری نے مجھے اُدھر سے نیچے تک گھور کر دیکھا اور بولا۔ بھئی اُن کے سفر کی بے سرو پا کہانی پر تو کسی نے یقین نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے عجیب و غریب جانور دیکھے ہیں۔ اُن کے بہت دُھندلے فوٹو بھی دکھاتے ہیں مگر فوٹو تو جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔ اُن کی پوری کہانی بھی کسی نے سنی؟ میں نے پوچھا جس پر ہنری نے جواب دیا۔

مستے کیسے؟ بات کر دو تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔

بچارے ویڈلی کا قصہ تو سنا ہی ہو گا تم نے؟
وہ کیا؟ میں نے دل چسپی سے پوچھا۔

ادارہ حیوانیات کے ایک رکن ویڈلی نے انہیں اس مضمون کا رقعہ بھیجا کہ ادارہ حیوانیات کے صدر کی خواہش ہے کہ پروفیسر جے پنجر ادارے کے ایک جلسے میں شرکت کر کے ہم سب کو شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔

پھر کیا ہوا؟ میں نے پوچھا۔

پروفیسر جے پنجر نے اس کا جواب یہ دیا کہ ادارہ حیوانیات کے صدر جہنم رسید ہو کر پروفیسر جے پنجر کو شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔ یہ کہہ کر ہنری ہنسنے لگا۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ واقعی پروفیسر جے پنجر سے ملنا تو ایک چیلنج تھا۔

ہنری مجھے اپنے دفتر لے گیا اور کافی تلاش کے بعد ایک پرانا رسالہ نکالا جس میں پروفیسر جے پنجر کا وہ مضمون شائع ہوا تھا جو شہر ویانا میں حیوانیات کے ماہروں کی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا اور اس پر کافی ہنگامہ ہوا تھا۔

میں نے مضمون پڑھا۔ سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ پروفیسر نے ڈارون کے نظریہ ارتقا کی خوب دھجیاں بکھیری تھیں۔ اچانک مجھے ایک بات سوجھی۔ میں نے ہنری سے کاغذ مانگ کر پروفیسر کے نام ایک خط لکھا۔

محترمی پروفیسر چیلنجر۔ آداب عرض

میں حیوانیات کا ایک طالب علم ہوں۔ آج آپ کا اس موضوع پر ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کئی بار پڑھنے کے باوجود چند باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات کر کے اپنے علم میں اضافہ کروں۔ پرسوں (بدھ) کی صبح کو میں گیارہ بجے حاضر ہو کر آپ سے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔

آپ کا عقیدت مند

ایڈورڈ میلون

پھر میں نے یہ خط ہنری کو دکھا کر پوچھا: "کیسی رہی؟"
"جواب نہیں" اس نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

نک چرٹھا پروفیسر

بدھ کی صبح کو میں ہنری کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے ایک خط دیا۔ میرا نام اور پتا ایک ایسی تحریر میں تھا جو خار دار تار سے جلتی جلتی تھی۔ میں نے جلدی سے خط کھولا لکھا تھا۔

جناب آپ کا خط ملا۔ آپ کی طرح بہت سے لوگ علم حیوانیات کے طالب علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر سب نالائق ہیں۔ میں آپ کو کوئی بات تو بتا سکتا ہوں لیکن اسے سمجھنے کے لیے دماغ نہیں دے سکتا۔ بہر حال آپ آئیے۔ اور ہاں پھانگ پر میرے ملازم اسٹن کو میرا یہ لفافہ دکھا دیجیے گا۔ تب ہی وہ اندر آنے دے گا۔ میں نے اسے ہدایت کر رکھی ہے کہ ایسے کسی گدھے کو اندر نہ گھسنے دے جو اپنے آپ کو اخباری رپورٹر کہتا ہو۔

آپ کا مخلص

جارج ایڈورڈ چیلنجر

ہنری خط دیکھ کر کہنے لگا۔ مجھ نے سے پہلے اپنی ماں سے دودھ

بخشوا لینا۔
 ”تم فکر نہ کرو۔ میں نے جواب دیا اور گھڑی دیکھ کر پرنسپل جیلنجر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ پچانک پر آشن شکاری گتے کی طرح سینہ پھلاٹے کھڑا تھا۔ میں نے اسے نفاذ دکھایا تو اس نے مجھے اندر جانے دیا۔

اندر پہنچ کر ایک ڈبلی پٹی خائون ملیں۔ آنکھوں نے مجھے روک کر پوچھا: کیا آپ میرے شوہر سے پہلے بھی کبھی ملے ہیں؟
 ”جی نہیں۔ یہ پہلا موقع ہے۔“

”تو ذرا ہوشیار رہیے گا۔ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔“
 جیم جیلنجر کے یہ الفاظ سن کر میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھیں۔ بہر حال اس اطلاع پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولیں۔

”ان کی ہر بات مان لینا۔ بحث مت کرنا۔ پھر بھی اگر معاملہ بے قابو ہو جائے تو گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ میں آ جاؤں گی۔ دنیا میں میرے سوا کوئی انہیں قابو میں نہیں کر سکتا۔“

ان ہدایات کے ساتھ آنکھوں نے دروازہ کھول کر مجھے پرندے کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ ایک چوڑی میز کے دوسری طرف گھنٹی والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میز پر کتابوں اور نقشوں کا انبار لگا تھا ایک گلوب بھی رکھا ہوا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی کرسی گھوم

اور پرنسپل کا چہرہ میری جانب ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ کسی عجیب آدمی سے پالا پڑے گا۔ مگر آف میرے خدا، ایسے آدمی کا تو تصور ہی نہ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اتنا بڑا سہرا سنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی کے نیچے چھپا ہوا چہرہ اور موٹی گردن موٹن جو ڈارو کے بل کی یاد دلاتی تھی۔

سینہ اور پیٹ کسی بڑے پیسے کی طرح تھا۔ بازوؤں پر نگاروں کا دھوکا ہوتا تھا۔ کلاٹیاں بہت موٹی اور بے ہنگم سی تھیں جن پر دیکھ کے سے بال تھے اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو بالکل یہی محسوس ہوا جیسے کوئی سانڈ ڈکرا رہا ہو۔

”ہاں، تو آپ ہیں علم حیوانیات کے وہ طالب علم؟“ یہ کہتے ہوئے آنکھوں نے میز پر سے میرا خط اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

میرے مضمون کی چند باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ یعنی باقی باتیں آپ سمجھ گئے؟ کیوں؟

میں گھبرایا کہ اگر یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا سمجھے تو سارا پول کھل جائے گا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے کہا۔ ”ویانا میں ان لوگوں نے تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔“

”میاں، میں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں سے خود نمٹ سکتا ہوں۔ تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جی ہاں، جی ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”اچھا، وقت برباد مت کرو۔ جلدی پوچھو کیا پوچھنا ہے؟“
 ”میلر مطلب تھا کہ آج کل کے سائنس دان —“
 ”گھاس کاٹتے ہیں آج کل کے سائنس دان۔“ انھوں نے میری
 بات کاٹ کر کہا۔

”دیکھیے نا ڈارون نے کہا تھا۔“

”جاہل تھا ڈارون۔“

”ارتقا کے بارے میں آپ کا نظریہ مختلف ہے۔“

”بالکل — میرا نظریہ یہ ہے کہ ارتقا کی رفتار ہر جگہ ایک سی

نہیں رہی ہے۔“

”اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟“

”اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لندن میں تم سے بڑا دھوکے باز

کوئی نہیں۔ تم ایک حقیر کپڑے ہو اور اپنے آپ کو اخبار نویس کہتے

ہو۔ نہ تمہیں سائنس آتی ہے اور نہ آداب۔“

”اسنا کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ غصے کے مارے ان کی آنکھیں

آبی پڑ رہی تھیں۔“

”دیکھیے جناب آپ کو میری توہین کرنے کا حق نہیں ہے۔ میں نے

کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔“

”کم سخت — حق کے بچے۔ ٹھہر تو سہی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرا

چھٹے۔ یوں تو میرا ذہن بھی دامن سے اُپر تھا اور فٹ بال کا بہت
 اچھا کھلاڑی تھا لیکن پروفیسر تو ایک گینڈے کی طرح تھے۔
 وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے اپنے سچاؤ کی بڑی کوشش کی لیکن
 وہ مجھے دھکیلتے ہوئے زینے کی طرف لے چلے اور پھر ہم دونوں لڑھکتے
 ہوئے نیچے گر پڑے۔

یہ زینہ مکان کے باہر کی طرف نکلتا تھا۔ میری خوش قسمتی سے

ایک پولیس کا انسپکٹر ادھر سے گزر رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا اور بولا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟ پروفیسر صاحب پچھلے دو مہینے میں تین مرتبہ آپ

کے خلاف رپورٹ کی رپورٹیں آچکی ہیں۔ آپ کی شہرت کی وجہ سے

ہم نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب عد ہو گئی ہے۔ چلیے میرے ساتھ

تھانے۔“

”نہیں جناب، یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں

نے کہا۔“

میری اس بات پر پولیس افسر کو تعجب ہوا اور پروفیسر تو ہکا بکار ہ

گئے۔ جب پولیس افسر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو پروفیسر نے آہستہ سے

کہا۔

”میرے ساتھ اُپر آؤ۔ نالائق کہیں کے۔“

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب بیڑھیاں چڑھنے لگے اور میں بھی لنگڑاتا،

مگر سہلانا ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

بیوی نے دانت بھینچ کر بڑی مشکل سے یہ لفظ ادا کیے اور پروفیسر نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اُسے زمین پر اتار دیا۔ وہ بچاری شرمندہ سی ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”آپ واقعی عجیب و غریب آدمی ہیں۔“ میں نے کہا جس پر پروفیسر نے ایک قہقہہ لگایا اور دروازہ بند کرنے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر اپنی گرسی پر جا بیٹھے اور میز کی دراز سے سگار کا بکس نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے سگار لے کر سگایا تو پروفیسر کہنے لگے

”اس ذیل پولیس والے کے سامنے تم نے جو کچھ کہا اس سے مجھے احساس ہوا کہ اگرچہ تم بھی عام لوگوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہو مگر ہو شریف آدمی۔“

”شکریہ“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اب میں تمہیں اپنے جنوبی امریکہ کے حیرت انگیز سفر کے بارے میں بتاؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ میری بات مت کاٹنا۔ اور یہ باتیں میری اجازت کے بغیر نہ تم اخبار میں شائع کر دو گے اور نہ کسی کو بتاؤ گے۔“

انکار کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ مجھے وعدہ کرنا پڑا۔

”اپنی عزت کی قسم کھاؤ۔“

”میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں۔“

”اوپر بیچ کر تو پروفیسر کی شامت ہی آگئی۔ اُن کی دہلی پتلی بیوی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اُن پر برس رہی تھی۔“ وحشی کہیں کے۔ اس شریف آدمی کے ساتھ ایسا ذلیل برتاؤ؛

”شرم نہیں آتی تمہیں؟“

پھر وہ خاتون مجھ سے بولیں۔ ”معاف کیجیے گا۔ اگر میں پہلے آجاتی تو یہ نوبت نہ آتی۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں نے مسکرا کر کہا مگر وہ شریف عورت اپنے شوہر کو معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔“

”تم سارے محلے میں مشہور ہو چکے ہو۔ میں تو شرم کے مارے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔“

پروفیسر حلیج اس طرح ہنسے جیسے بیوی کی باتوں میں انہیں لطف آ رہا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی بیوی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر سگ مرم کی کانس پر بٹھا دیا جو زمین سے کوئی سات فٹ اونچی تھی۔

”ارے میں گر پڑوں گی۔ اتار دیجئے۔ وہ بچاری بھسی طرح چیخ رہی تھی۔ پروفیسر مسکرائے اور بولے۔

”ایسے نہیں۔ یوں کہو۔ اے دنیا کے عظیم ترین پروفیسر مجھے

نیچے اتاریے۔“

”اچھا یہ لو۔ اے دنیا کے عظیم ترین پروفیسر مجھے نیچے اتاریے۔“

لیکن مجھے کیا معلوم کہ تم عزت دار ہو بھی۔
 "پروفیسر: میں چیخ پڑا۔ زندگی میں آج تک کسی نے میری اتنی
 بے عزتی نہیں کی۔"

پروفیسر میرے بگڑنے سے خفا نہیں ہوئے بلکہ مسکراتے ہوئے میرے
 چہرے کا جائزہ لینے لگے۔

"ہوں۔ گول سر۔ بھوری آنکھیں۔ سیاہ بال جو ہلکے خم دار
 ہیں۔ تمہارا تعلق کلٹاک نسل سے معلوم ہوتا ہے۔"

"میں آئر لینڈ کا رہنے والا ہوں؟"

"تب ٹھیک ہے۔ پروفیسر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا
 اس کے بعد آنکھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"تمہیں شاید معلوم ہو کہ کوئی دو سال ہوئے میں نے جنوبی امریکہ کا
 سفر کیا تھا۔ تمہارے سائٹس دائروں نے وہاں کے جانوروں کے بارے
 میں جو ویلیس دی ہیں میں انہیں نہیں مانتا۔ اس لیے میرا ارادہ تھا
 کہ ان کی تحقیقات کو جھٹکا کر اصل حقیقت دنیا کے سامنے پیش
 کروں؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ دریائے ایمیزن کے اطراف کے کچھ علاقوں پر
 آج تک کوئی نہیں گیا اور اس دریا کے کچھ معاون دریاؤں کے
 راستوں کی کھوج کسی نے نہیں کی۔ میں چند ایسے ہی علاقوں میں گیا
 ہوں اور علم حیوانات کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کر لی ہیں

ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ واپسی پر میں مقامی باشندوں کی ایک
 چھوٹی سی بستی میں بھی بٹھرا جو اس جگہ واقع ہے جہاں ایک ندی
 دریائے ایمیزن میں گرتی ہے۔ اس جگہ کا نام میں نہیں بتاؤں گا۔

اس گاؤں کے کچھ لوگ سفر میں میرے ساتھ تھے۔ راستے میں کوئی
 پیار پڑتا تو میں اسے دوا دیا کرتا۔ اس سے وہ مجھے کوئی بڑا ڈاکٹر
 سمجھنے لگے تھے۔ واپسی پر آنکھوں نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ
 میں چل کر ایک مریض کو دیکھ لوں۔ جب میں ان کے سردار کے ساتھ
 اس کی جھونپڑی میں پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مریض
 کوئی مقامی باشندہ نہیں بلکہ گوری نسل کا ایک آدمی ہے۔ اس کا
 لباس پھٹا ہوا تھا اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بڑی
 سختیاں جھیلی ہیں۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ جنگل سے وہ اکیلا ہی
 یہاں پہنچا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں نے نبض دیکھی تو پتا چلا
 کہ وہ مر چکا ہے۔

اس آدمی کا تھیلہ بھی وہیں پڑا تھا۔ اس کا جائزہ لینے پر ایک
 تختی ملی جس پر اس کا نام اور پتا لکھا تھا۔ میسل وہائیٹ۔ لیک
 ایورنیو، ڈیٹرائٹ میٹ مشین۔ وہ شاعر تھا اور آرٹسٹ بھی۔ تھیلے
 میں اس کی کچھ نظمیں اور تصویریں بنانے کے سامان کے علاوہ یہ ہڈی
 بھی تھی جو میری مینر پر رکھی ہوئی ہے۔ تھیلے میں تیلیوں کے باسے
 میں ایک کتاب، ایک ریولور اور کچھ کارٹوس بھی تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

میں وہاں سے واپس ہو ہی رہا تھا کہ میری نظر اُس کی پھٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی۔ اُس کی جیب میں ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ یہ اُس کی خاکے بنانے کی کاپی تھی جو اُس وقت بھی ایسی ہی بوسیدہ اور پھٹی ہوئی تھی جیسی اب ہے۔ تم اس کا ایک ایک صفحہ دیکھو۔

یہ کہہ کر پروفیسر نے کاپی مجھے دے دی اور خود سگار مسکا لیا۔ میں نے کاپی کو کھولا۔ میرا خیال تھا اس میں کوئی چونکا دینے والا بات ہوگی لیکن پہلے صفحے پر ایک موٹے سے آدمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کئی صفحات پر مقامی لوگوں اور اُن کے رہنے سہنے کے بارے میں خاکے سے تھے۔ کچھ عورتوں اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ ایک جگہ کچھ بے کوائفوں کے پاس دکھایا گیا تھا ایک صفحے پر مگر مجھ نے ہونے لگے۔

”یہ مگر مجھ میں؟ میں نے کہا۔

”اسے ناکا کہتے ہیں۔ مگر مجھ جنوبی امریکہ میں نہیں ہوتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ پروفیسر تقریر نہ شروع کر دے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ ”مگر ان تصویروں میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”ذرا صفحہ تو اُلٹو۔“ پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

میں نے صفحہ اُلٹا۔ یہ ایک منظر کی تصویر تھی۔ زردی مائل سبز زمین پر کچھ پودے تھے۔ آگے جا کر زمین اُوپر کی طرف اُٹھتی ہوئی چھماق کی چٹانوں سے مل جاتی تھی۔ ان چٹانوں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر اتنی ہی بلند ایک مخروطی چٹان تھی جس پر ایک اونچا اور مضبوط درخت تھا۔ چٹانوں کی دیوار کے اوپر درختوں کی سبزی جھلک رہی تھی۔ اس کے اوپر نیلا آسمان تھا۔ اگلے صفحے پر پھر یہ منظر تھا مگر اس مرتبہ چھماق کی دیوار نما چٹان کے قریب جا کر خاکہ بنایا گیا تھا۔

”اب کیا کہتے ہو؟ پروفیسر نے کہا۔

”میرے خیال میں یہ ایک حیرت انگیز منظر ہے۔“

حیرت انگیز ہی نہیں، اپنی قسم کا اُلٹا دکھا اور لاجواب منظر۔ اب ذرا اگلا صفحہ دیکھو۔“

میں نے صفحہ اُلٹا تو اس پر ایک عجیب و غریب جانور کی تصویر نظر آئی۔ میرے خیال میں ایسا جانور کسی افیمبی کے تصور ہی میں آسکتا تھا۔ اس کا سر کسی پرندے کی طرح تھا۔ جسم ایک بہت بڑی ہسکلی کا سا اور لمبی سی دم چوڑے چاتو کے پھل کی طرح تھی۔ اس جانور کے سامنے ایک آدمی خوف زدہ کھڑا تھا۔

”کیا خیال ہے؟ پروفیسر نے پوچھا۔

”عجیب جانور ہے۔“

”لیکن آس نے یہ جانور کیوں بنایا؟“

”دیوانہ ہو گیا ہو گا۔“

”ہا ہا۔ تم کس ہیں تک پہنچ سکتے ہو؟“

”اور آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے پوچھا۔“

”یہ جانور حقیقی ہے اور اس کے سامنے بیٹھ کر یہ تصویر بنائی

گئی ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ اگر یہ تصویر اصلی ہے تو یہ آدمی تو بونا معلوم ہوتا ہے اور بونی نسل کے لوگ صرف افریقہ ہی میں پائے جاتے ہیں۔“

”یہ آدمی بونا نہیں ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ جانور کی پشت پر پام کا جو درخت ہے اس کی اونچائی سچاس ساٹھ فٹ ہوتی ہے اس سے اندازہ لگا لو۔ اس آدمی کا قد سوا پانچ فٹ کے لگ بھگ ہے۔“

”پھر یہ جانور اتنا بڑا ہوا کہ پورے چڑیا گھر میں بھی شاید ہی آسکے۔“

پروفیسر جینر نے الماری میں سے ایک موٹی سی کتاب نکالی اور صفحے الٹ مٹلٹ کر کے ایک تصویر مجھے دکھائی۔ یہ فرضی تصویر ایک ڈینو سار کی تھی یعنی آس دیو جیسے خوفناک جانور کی؟ اب ناپید ہے۔ کتاب میں لکھا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ موجود

آدمی کی اونچائی سے دو گنی ہوتی تھی۔ یہ تصویر اور امریکی آرٹسٹ کا خاکہ آپس میں بہت ملتے تھے۔ پھر بھی میرا دل اس پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ ایسا جانور اب بھی موجود ہے۔ میں نے کہا۔

”ہو سکتا ہے اس آرٹسٹ نے یہ تصویر دیکھی ہو اور پھر حافظہ کی مدد سے اُسے بنا لیا ہو۔“

”اچھا تو یہ ہڈی دیکھو۔“ پروفیسر نے وہ ہڈی میز پر سے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ یہ کوئی چھ انچ لمبی اور انگوٹھے سے کچھ موٹی تھی۔ پروفیسر نے پوچھا۔

”تمہارے خیال میں یہ ہڈی کس کی ہو سکتی ہے؟“

”میرے خیال میں تو یہ کسی لمبے چوڑے انسان کی ہنسل کی ہڈی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہنسل کی ہڈی میں خم ہوتا ہے۔ یہ سیدھی ہے۔ پھر اس پر یہ جو نشان ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک نس بھی اس سے مل کر گزری تھی۔“

”پھر مجھے نہیں معلوم یہ کیسی ہڈی ہے؟“ میں نے کہا۔ اس پر پروفیسر نے ایک ڈبیا کھول کر چنے کے برابر ایک ہڈی نکال کر دکھائی اور بولے۔ ”یہ ہڈی انسان کی ہے۔ اسی قسم کی ہڈی یہ بھی ہے۔“

”پھر یہ کسی ہاتھی کی ہوگی۔“ میں نے جلدی سے کہا جس کے

گورڈ پوری کا نام سنتے ہی لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے دو آدمیوں کو تیار کر لیا اور ایک لمبا سفر کرنے کے بعد، جس کی سمت میں نہیں تباؤں گا، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں مرحوم میپل دہائیٹ سے پہلے کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے ہوں گے۔ ذرا اسے دیکھو۔

یہ کہہ کر پروفیسر چلینجر نے مجھے ایک نوٹ دیکھنے کو دیا جو دھندلا سا تھا۔ پروفیسر کہنے لگے۔ "واپسی پر ایک حادثے میں ہماری کشتی ڈوب گئی اور کھینچی ہوئی فلموں کا صندوق پانی میں گر پڑا جس سے ساری فلمیں خراب ہو گئیں۔"

میں نے غور سے تصویر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی منظر تھا جو میپل دہائیٹ کی خاکوں کی کتاب میں تھا۔ پھر پروفیسر نے ایک تصویر دکھائی جو قریب کی تھی۔ اس میں سطح مرتفع کے قریب والی مخروطی پہاڑی اور اس پر ایک اونچا مضبوط درخت صاف نظر آ رہا تھا۔

"درخت پر دکھائی دیا کچھ؟ پروفیسر نے پوچھا۔

"کوئی چڑیا ہے۔" میں نے غور سے دیکھتے ہوئے بتایا۔ پروفیسر نے ایک مختصراً شیشہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس پرندے کے ایک لمبی سی چونچ تھی۔ پروفیسر نے بتایا کہ ان کے پاس اور بھی ثبوت تھے لیکن کشتی کے اس

جواب میں پروفیسر نے کہا۔

"جنوبی امریکہ میں ہاتھی نہیں ہوتا۔"

"تو کوئی دوسرا جانور ہو گا۔"

"یہ کسی ایسے جانور کی ہڈی نہیں ہے جو آج موجود ہو بلکہ کسی بہت بڑے، بہت طاقتور اور بہت خوفناک قسم کے جانور کی ہے۔"

"یہ تو بڑی دل چسپ بات ہے۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں تو میں تم سے مایوس نہیں ہوں کہ تمہیں اس سے دل چسپی ہے۔ ہاں تو یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد میں چھان بین کیے بغیر واپس کیسے آتا رہتا ہوں؟ مجھے مقامی لوگوں کی مدد درکار تھی۔ تمہیں معلوم ہے اس علاقے کے لوگوں میں ایک نام بہت مشہور ہے۔ گورڈ پوری۔"

"گورڈ پوری۔" میں نے تو یہ نام کبھی نہیں سنا۔

"گورڈ پوری سے مراد ہے جنگل کی روح۔ ایک ایسی چیز جس سے ڈرنا چاہیے کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی لیکن سب اس سے ڈرتے ہیں اور یمن کے آس پاس کے سارے قبائلی جاتے ہیں کہ گورڈ پوری کہاں رہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔"

حادثے کا بڑا ہوساری چیزیں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک چیز بچی ہے۔ یہ کہہ کر اٹھنوں نے دراز میں سے کوئی دو ٹکڑے کی خمدار ہڈی نکالی جس میں جھلی لگی تھی۔

”یہ شاید کسی بہت بڑی چمکارٹھ کا بازو ہے۔“ میں نے کہا، ”کیا فضول بک رہے ہو؟“ پروفسیر نے غصے سے کہا اور پھر وہ چڑیا کے بازو اور چمکارٹھ کے پنجوں کے بارے میں بتانے لگے۔ ”پھر یہ کون سا پرندہ ہو سکتا ہے۔“ میں نے عاجز آ کر کہا۔ جواب میں پروفسیر نے پھر وہی کتاب نکالی اور ایک دیونا چڑیا کی تصویر دکھائی جو کسی زمانے میں رہی ہوگی۔ تصویر کے نیچے اُس کا نام ”ٹیرڈ کٹائل“ لکھا تھا۔ دوسرے صفحے پر اس کے پروں اور بازوؤں کی ہڈیوں کا پنجر دکھایا گیا تھا۔ پروفسیر نے ایک ہڈی پر انگلی رکھ کر کہا۔

”دیکھو، یہ ایسی ہی ہڈی ہے نا؟“

آپ یقین کیجیے، خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ہڈی اور تصویر دونوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ چڑیا کسی ہوائی جہاز سے چھوٹی نہ ہوگی۔ میرے دل میں اچانک پروفسیر کے لیے عزت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ ”پروفیسر صاحب، آپ واقعی سائنس کے کوہیں ہیں۔ آپ نے ایک نئی دنیا تلاش کر لی ہے۔“

پروفیسر مسکرا دیے اور پھر اٹھنوں نے اپنا قصہ دوبارہ شروع کیا۔ ہاں تو مٹر میلون۔ ہوا یہ کہ برسات شروع ہو گئی۔ میرے پاس خوراک ختم ہونے لگی۔ میں اُس بڑی سطح مرفوع کے دامن تک تو پہنچ گیا۔ لیکن اوپر چڑھنے کا راستہ نہیں ملا۔ اُس کے پاس جو گاؤں دم پہاڑ کی تھی اُس پر چڑھنا نسبتاً آسان تھا۔ میں صرف آدھی دو چڑھ سکا۔ وہاں سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ سطح مرفوع بہت وسیع ہے اور اُس پر ایک گھنٹا جنگل ہے۔

”کیا آپ نے وہاں زندگی کے کچھ اور بھی آثار پائے؟“ نہیں۔ لیکن اس امر کی تہ جو جانور بنا یا ہے اس کے بارے میں اب تمہاری کیا رائے ہے؟ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔

”بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ اُس نے کسی طرح اوپر پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ لکالا تھا۔ جہاں اُس نے یہ جانور دیکھا۔ لیکن یقیناً وہ راستہ بڑا ہی کمٹن اور دشوار گزار ہوگا تبھی تو یہ جانور وہاں سے نیچے نہیں آسکتے۔“

لیکن یہ جانور وہاں کیسے آئے؟ میں نے سوال کیا۔ ”بات یہ ہے کہ جنوبی امریکہ یوں تو ایک خاص قسم کے پتھر جسے گرنائیٹ کہتے ہیں کی چٹانوں سے بنا ہوا ہے مگر کسی زمانے میں ہاں کوئی ایسا زلزلہ آیا ہوگا کہ ایک خطہ زمین کی سطح سے اٹھ کر اچانک

بلند ہو گیا ہوگا۔ اس خطے میں جتنے چوند پرند ہوں گے وہ بھی اس کے کیسی نمائش؟ میں نے پوچھا۔
 ساتھ ہی اُدپر اٹھ گئے ہوں گے۔ اسی لیے اس کی لگریں بالکل سیدھی ادارہ حیوانیات کے ہال میں مسٹر پرسول والڈرن جنہیں حیوانیات
 دیوار کی طرح ہیں اور حقیقت کی قسم کے اُس بھورے پتھر کی ہیں جو نباتات کا ماہر سمجھا جاتا ہے، تقریر کر رہے ہیں اور مجھے ان کا شکریہ
 زمین کی اندرونی تہوں میں پایا جاتا ہے۔ باقی دنیا میں قدیم قسم کا کرنا ہے۔ تم ضرور آنا۔ ذرہ مزہ رہے گا۔
 کے جانور ختم ہو گئے لیکن ممکن ہے وہاں باقی رہ گئے ہوں۔ یہ کہہ کر پروفیسر کے چہرے پر اُس شریبے کی سی مسکراہٹ
 ”آپ کی تحقیقات بہت شاندار ہیں پروفیسر صاحب۔“ میں سنبھل گئی جو کوئی شرارت سوچ کر اس کے بیچے کے خیال سے دل
 بڑے جوش سے کہا۔ ”صرف اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ادبی دل میں تطف لے رہا ہوں۔“

ہے۔
 میں بھی یہی سمجھا تھا۔“ پروفیسر نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا
 لیکن جب میں نے زبان کھولی تو لوگ جہالت اور حسد کی وجہ سے
 اعتراض کرنے لگے اور کسی نے پوری بات کہنے کی مہلت ہی نہ
 دی۔ آخر میں بھی چڑ گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ دنیا میں سب جاہل
 ہی جتے ہیں۔ یہ نالائق اس قابل ہی نہیں کہ کوئی سائنسی تحقیق
 ان کے سامنے پیش کی جائے۔“

یہ کہہ کر پروفیسر خاموش ہو گئے اور میں نے دل میں سوچا کہ
 واقعی اس شخص کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ کچھ دیر کی خانہ
 کے بعد پروفیسر کے چہرے سے رنج و غم کے اثرات دود ہو گئے
 اور وہ کہنے لگے۔

”آج رات ایک نمائش ہے تم ضرور چلنا۔“

ہی یہ بھی کہا کہ ابھی انہیں شائع نہ کیجیے گا ورنہ پروفیسر بھر جائے گا اور کوئی اور بات نہیں بتائے گا۔ میں اس کا اعتماد حاصل کر کے پوری باتیں معلوم کر لوں گا اور انہیں اخبار میں چھاپنے کی اجازت بھی لے لوں گا۔

اس کے بعد تہری سے جب میری ملاقات ہوئی اور میں نے اسے یہ باتیں بتائیں تو وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ اس نے کہا۔

یہ اتنی عظیم دریافت کے بعد کوئی یہ نہیں کہا کرتا کہ ثروت ضائع ہو گئے۔ ایسی باتیں بس قصہ کہانیوں ہی میں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ امریکی شاعر ادوارٹسٹ؟ میں نے پوچھا۔

”وہ چلینجر کے ذہن کی پیداوار ہے۔“

”اور خاکوں کی وہ کاپی؟“

”وہ کاپی چلینجر کی ہے۔“

”اور وہ نوٹو؟“

”اس میں ایک چڑیا کے سوار رکھا ہی کیا ہے؟“

”مگر وہ معمولی چڑیا نہیں ہے۔ ٹیروڈ کٹائل ہے۔“

”یہ بات اسی نے تمہارے ذہن میں بٹھائی ہے۔“

”اور وہ ہڈیاں؟“

”پروفیسر جیسے آدمی کے لیے جعلی ہڈیاں تیار کر لینا کیا مشکل ہے

میں نے سوچا کہیں بات بگڑ نہ جائے اس لیے مختصر الفاظ میں وہ باتیں بتا دیں جو پروفیسر سے مجھے معلوم ہوئی تھیں لیکن تم یقین کر دینا کہ وہ ہے۔“

ہنگامہ

پروفیسر کے مکان سے باہر نکل کر میں نے ٹیکسی لی اور اپنے آگیا۔ پروفیسر مجھ سے کہ چکا تھا کہ جو باتیں وہ بتائے وہ اخبار میں شائع نہ کی جائیں۔ اس لیے جب ایڈیٹر نے پوچھا کہ پروفیسر سے کیا بات چیت ہوئی؟ تو میں نے جواب دیا۔ ”کوئی ایسی بات نہیں جس کی خبر سن سکے۔ ایڈیٹر نے سر سے پوچھے دیکھا اور بولا۔

”یہ تم کیسے کہتے ہو؟ تمہاری آنکھ پر نیل پڑا ہوا ہے۔ یہ بھی خبر سن سکتی ہے۔ پروفیسر نے یقیناً تمہیں بار بار اس پہلے بھی ایسی حرکتیں کر چکا ہے۔ اخباری نمائندوں کے ساتھ یہ غنڈہ گردی نہیں چلے گی۔ میں ایسی رپورٹ لکھوں گا کہ تمہاری چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔“

میں نے سوچا کہیں بات بگڑ نہ جائے اس لیے مختصر الفاظ میں وہ باتیں بتا دیں جو پروفیسر سے مجھے معلوم ہوئی تھیں لیکن تم یقین کر دینا کہ وہ ہے۔“

ہنری کی باتیں سن کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ میرا دل پر دنیسیر کو فرائڈ ماننے کو تیار نہ تھا۔ آخر میں نے ہنری کو راضی کر لیا کہ وہ رات کو ادارہ حیوانیات کے جلسے میں میرے ساتھ چلے۔

جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو موقع سے زیادہ مجمع پایا۔ اگر قطاروں میں بہت سے سائینس دان اور پر دنیسیر قسم کے لوگ بٹھکتے۔ ڈاکٹری کے طالب علموں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ جب کوئی ہال میں داخل ہوتا تو یہ لوگ فقرے کہتے۔ یوں تو تھوڑا بہت ہنگامہ ہر شخص کی آمد پر ہوا لیکن جب پر دنیسیر چیلینجر داخل ہوا تو شور و غل کے مارے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن شاہنشاہ سے پر دنیسیر کو۔ میرا شیر برابر مسکراتا رہا۔ کیا مجال ذرہ برابر بھی ماتھے پر بل آیا ہو۔

آخر جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر والڈرن کا تعارف کرایا گیا۔ وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر کا انداز بڑا اچھا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی پیدائش کا حال انھوں نے پر لطف انداز میں بیان کیا کہ لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگے۔ انھوں نے تیرنے والے اور رنگینے والے جانوروں کا تعارف سے ذکر کیا اور پھر کنگرو اور چوہے کی مٹی مٹی شکل کے اس جانور پر پہنچے جسے سائینس دان دودھ پلانے والے موجودہ جانداروں کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

”یہاں آپ جتنے لوگ موجود ہیں سب اسی کی اولاد ہیں۔“ اس پر پچھلی صفوں میں سے ایک طالب علم نے نہیں نہیں کی آواز بگند کی جسے سن کر مسٹر والڈرن نے کہا۔ ”ادھر پچھلی صف میں جو صاحب مٹرخ ٹائی لگائے بیٹھے ہیں وہ شاید انڈے سے پیدا ہوئے ہیں۔“

اس پر ایک زوردار قہقہہ لگا۔ غرض ان کی پوری تقریر کے دوران یوں ہی ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ تقریر زور شور سے جاری تھی کہ اچانک ایک بھاری آواز ہال میں گونجی۔

”اے سبحان اللہ“

یہ پر دنیسیر چیلینجر کی آواز تھی۔ سب ہنس پڑے اور تقریر کرنے والا بوکھلا گیا۔ چند لمحے بعد اس نے پھر تقریر شروع کی تو پر دنیسیر نے فقرہ کہا۔

”کیا کہنے؟“

پر دنیسیر نے جب چار پانچ مرتبہ یہ حرکت کی تو مسٹر والڈرن کو غصہ آ گیا۔ وہ چیخ کر بولے۔ ”اب تو انتہا ہو گئی۔ مجھے آپ سے کہنا پڑے گا مسٹر چیلینجر کہ آپ بدتمیزی نہ کریں۔“

”اور مجھے آپ سے کہنا پڑے گا مسٹر والڈرن کہ آپ سائینس کا عملیہ نہ بگاڑیں۔“ یہ پر دنیسیر چیلینجر کا جواب تھا جس پر ایسا شور مچا کہ خدا کی پناہ۔

”یہ بکو اس ہے۔ جھوٹ ہے۔ مجمع سے طرح طرح کی آوازیں
 بند ہوئیں۔ ایک آواز آئی۔ ثابت کرو۔“
 پروفیسر نے کہا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔ میں وہاں گیا ہوں۔
 میں نے ایسے جانور دیکھے ہیں۔“

”جھوٹا کہیں کا۔“ ایک آواز آئی۔ اس پر پروفیسر چلنے پر
 گئے۔ اُنھوں نے فوراً استیناس چڑھا لیں اور گرج کر بولے۔
 ”یہ کس کی آواز ہے؟ کس نے مجھے جھوٹا کہا؟“

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب دیکے بیٹھے رہے۔ کوئی
 نہ بولا۔ پروفیسر نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔ ”ہر اس شخص
 کو جس نے کوئی نئی بات دریافت کی، اسی قسم کے احمقوں سے
 پالا پڑا ہے۔ جب کوئی بڑی تحقیق سامنے آتی ہے تو چھوٹے ذہن
 اسے سمجھ نہیں سکتے۔ تم ان لوگوں پر پتھر پھینکتے ہو جو اپنی جان جو کھو
 میں ڈال کر سائنس کے نئے افق دریافت کرتے ہیں۔ تم اہل علم
 کو پھانسیاں دینے والے ہو۔ چاہے وہ گلیلیلو ہو۔ چاہے ڈارون
 ہو۔ چاہے میں ہوں۔“

مجمع چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اچانک ایسا ہنگامہ مچا کہ کچھ
 خواتین نے تو وہاں سے کھسک جانے میں ہی خیریت سمجھی پروفیسر
 نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں ہلا ہلا کر کہا۔
 ”سچائی سچائی ہی رہے گی۔ چند بے وقوف نوجوان اور ان

آخر صدر جلسہ نے میز پر گھونٹے مار مار کر لوگوں کو خاموش کیا اور
 تقریر آگے چلی مگر والدین ایسے جبرائے ہوئے تھے کہ بہت جلد
 اُنھوں نے تقریر ختم کر دی۔

اب پروفیسر چلنے پھرنے کو گئے۔
 ”خواتین و حضرات۔ اتنا کہہ کر وہ رک گئے۔ پھر شور مچاتے
 ہوئے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔ ”معاف کیجیے گا۔ میرا مطلب
 ہے خواتین، حضرات اور بچے۔“
 اس پر شور مچانے والے شرما کر چپ ہو گئے اور پروفیسر نے

کہا۔
 ”دوسروں نے سختیاں جمیل کر جو تجربے کیے ہیں انہیں سستی شہرت
 یا مالی فائدے کی خاطر عام جلسے میں دہرا دینا بہت آسان ہے
 لیکن خود کوئی ٹھوس تحقیق کرنا بڑا مشکل ہے۔“
 ”یہ کیا بکو اس ہے۔“ مسٹر والدین نے چیخ کر کہا مگر پروفیسر
 ان کی بات نہیں سنی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

فاضل مقرر کی یہ دلیل بڑی بوری ہے کہ چونکہ اُنھوں نے
 پرانی قسم کا کوئی جانور اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا اس لیے وہ پا
 ہی نہیں جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں ایسے جانور پا
 جاتے ہیں جو ہاتھی کو ایک نوالہ بنا لیں اور وہیل مچھلی کو پورا
 جائیں۔“

”یہ بات میں بتانا نہیں چاہتا۔ البتہ اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو میں چاہتا ہوں۔“
 ”میں بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔“ مسٹر سمرلی نے بڑے جوش کے ساتھ اعلان کیا۔

”لیکن لوگ آپ کی گواہی کو بھی جھٹلا دیں گے۔ آپ کی تصدیق کے لیے کسی اور آدمی کو بھی ساتھ جانا چاہیے۔ ہے کوئی جانے والا؟“

مجمع میں چند لمحے خاموشی رہی۔ آخر ایک لمبا سا آدمی جو دریا میں کہیں بیٹھا تھا، اٹھ کر اسٹیج کی طرف چلا۔ ادھر اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ گلیڈی کو خوش کرنے کا یہی موقع ہے۔ یہ سوچ کر میں بھی لپکا۔ ہنری نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اُس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گیا اور اسٹیج کے سامنے پہنچ کر بولا۔

”میرا نام ایڈورڈ میلون ہے اور میں ڈیلی گزٹ کا رپورٹر ہوں ایک بالکل غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے میں جانے کو تیار ہوں۔“

میرے خاموش ہوتے ہی وہ لمبا آدمی بولا: ”میں لارڈ جان روکسن ہوں۔ ایمرن تک جا چکا ہوں اور اس علاقے سے واقف ہوں۔ اس تحقیقی سفر کے لیے میں اپنے آپ کو بڑا موزوں سمجھتا ہوں۔“ مشہور کھلاڑی اور سیاح لارڈ جان روکسن کو کون نہیں جانتا

کے احمق بزرگ چاہیں بھی تو اسے دبا نہیں سکتے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں نے سائنس کی ایک نئی راہ دریافت کی ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو میرا امتحان لے لو۔ ایک یا دو آدمی میرے ساتھ کر دو۔ کھوٹا کھرا سب ثابت ہو جائے گا۔“

حیوانی جسموں کی ساخت کے ماہر اور مشہور پروفیسر سمرلی نے کھڑے ہو کر کہا: ”مسٹر چلینجر، کیا آپ نے یہ معلومات ایمرن کے علاقے کے اس سفر کے دوران حاصل کیں جو آپ نے دو سال ہوئے کیا تھا؟“

”جی جناب۔“

”آپ سے پہلے اور سائنس دان بھی اُس علاقے میں گئے ہیں اُن کے سفر نامے ہمارے سامنے ہیں۔“ مسٹر سمرلی نے کہا۔
 ”مسٹر سمرلی کی اطلاع کے لیے میں عرض کر دوں کہ دریاٹے ایمرن دریاٹے ٹیمز سے بڑا ہے اور ایک یا دو آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انہوں نے پچاس ہزار مربع میل کے علاقے کا چتہ چتہ چھان مارا ہے۔“

اس پر مسٹر سمرلی نے کہا: ”میرے دوست نے یہ بتا کر کہ ایمرن ٹیمز سے بڑا ہے، میری معلومات میں جو اذعانہ کیا ہے اس کے لیے میں ان کا شکریہ گزار ہوں لیکن کیا وہ بتائیں گے کہ انہوں نے کن طول البلد اور عرض البلد کے درمیان سفر کیا تھا؟“

تھا۔ لوگوں نے انہیں اور مجھے دونوں کو منتخب کر لیا اور یہ طے پایا کہ ہم تین آدمی چلینجر کی کھوٹی ہونٹی دنیا کا کھوج لگا کر اس کے حیرت انگیز دعووں کی تصدیق کریں گے۔

لارڈ جان روکٹن کے ٹیم میں شامل ہو جانے سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے جنوبی امریکہ میں غلاموں کی ناجائز تجارت کرنے والوں کا خاتمہ کیا تھا اور اس تجارت کے سرغنہ پیڈرولو پز کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ ایسے خطرناک سفر میں اس شخص کا ساتھ ایک بہت بڑا سہارا تھا۔

میرے اخبار کے ایڈیٹر کو جب پتا چلا کہ میں اس سفر پر جا رہا ہوں اس نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور ہدایت کی کہ میں اپنے سفر نامے کی قسطیں بھیجتا رہوں۔ اشاعت تو ظاہر ہے کہ پروفیسر چلینجر کی اجازت ملنے پر ہی ممکن تھی۔

خطرناک سفر

یہ سطر میں بحری جہاز فرانسسکا کے کیمین میں لکھ رہا ہوں۔ جب یہ جہاز انگلستان واپس آئے گا تو میری یہ تحریر میرے اخبار کے ایڈیٹر کو پہنچ جائے گی۔

جہاز پر سوار ہوتے وقت پروفیسر چلینجر ہمیں پہنچانے آئے تھے۔ چلتے وقت انہوں نے ایک بند لفافہ دے کر کہا تھا۔

مساری ہدایات اس میں بند ہیں۔ اسے اس وقت تک نہ

کھولنا جب تک تم دریائے ایمرن کے کنارے واقع قصبہ مناوس تک نہ پہنچ جاؤ اور وہاں پہنچ کر بھی اسے اسی تاریخ کو اور اسی وقت کھولنا جو لفافے پر درج ہے۔ تمہیں تمہاری عزت کی قسم ہے کہ اس کے خلاف نہ کرنا۔

جہاز نے سیٹی دے دی اور چلنے لگا تو پروفیسر چلینجر کے بغیر نہ رہ سکے۔

”یہ مت سمجھنا کہ تم لوگ مجھ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ مجھے کسی

کے تصدیق کرنے نہ کرنے کی پروا نہیں ہے۔ تم جو کچھ کہو رہے ہو سائینس کے لیے کو رہے ہو اور بس۔

ہمارا سفر آرام سے گزرا۔ راستے بھر لارڈ جان روکسٹن اپنی شکاری فہموں کے ہفتے ساتھ رہے۔ جو واقعی حیرت انگیز تھے۔ آخر کسی قابل ذکر واقعہ کے بغیر ہم مناؤںس پہنچ گئے جو ایمرن کے کنارے ایک چھوٹا سا لیکن اہم قصبہ تھا۔ یوں تو ہم نے ایک سرائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہاں ہم مقامی لوگوں کے لیے اچھا خاصا تماشا بن جاتے۔ خدا بھلا کرے برازیل میں تجارت کرنے والی برطانوی کمپنی کے نمائندے شارٹ لین کا جس نے اپنے بگلے میں ہمیں ٹھہرایا اور بہت کچھ آڈ بھگت کی۔

پروفیسر چلینجر نے لفاظہ کھولنے کی جو تاریخ مقرر کی تھی اس میں ایک ہفتہ باقی تھا لہذا ہم آرام کرتے رہے۔ میرے دو ساتھیوں میں سے ایک مسٹر سمرفی چھبیس سال کے سنجیدہ بزرگ تھے اور بہت کچھ سرد گرم دیکھے ہوئے تھے انھیں کیڑوں مکوڑوں اور چڑیوں وغیرہ کے بارے میں تحقیق کا جنون تھا۔ وہ اسی میں مصروف ہو گئے۔ روز صبح کو بتیاں پکڑنے کا حال اور بندوق لے کر وہ ادھر ادھر نکل جاتے اور شام کو بہت سے نمونے لیے ہوئے واپس آتے۔ مجھے ان کی ایک ہی بات ناپسند تھی اور وہ یہ کہ وہ بہت گندے رہتے تھے۔ اپنے میلے کپڑوں یا میلے جسم سے

انہیں ذرا وحشت نہیں ہوتی تھی۔

دوسری طرف لارڈ جان روکسٹن ہر وقت صاف ستھرے اور خوش پوش رہنے کے عادی تھے۔ روز صبح بڑے اہتمام سے شیوہ بناتے اور استری کیے ہوئے کپڑے پہنتے۔ اس لیے ان سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔

راستے میں جب ہمارا جہاز پارا میں ٹھہرا تھا تو ہم نے اپنے سفر میں ساتھ لے چلنے کے لیے کچھ آدمی بھرتی کر لیے تھے۔ ان میں ایک زیمونامی حبشی بھی تھا۔ بالکل سیاہ فام اور کسی دیو کی طرح طاقت ور۔ فرمانبرداری میں وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح تھا اور عقل بھی بس گھوڑے ہی جتنی تھی۔ اسے ہم نے جہاز کی کمپنی کی سفارش پر رکھا تھا۔ اسی کمپنی میں نوکری کر کے وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگا تھا۔

زیمو کے علاوہ پارا میں ہی ہم نے ملی جلی نسل کے دو اور آدمی گومز اور مینوئل بھی رکھ لیے تھے۔ ان دونوں کی ڈاڑھیاں ٹھیک اور وہ چیتوں کی طرح پھرتیلے تھے۔ دونوں عرصے سے اس علاقے میں تھے اور گومز تو فر فر انگریزی بولتا تھا۔ ان لوگوں کو کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور سامان اٹھا کر ساتھ چلنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ہم نے بولیویا کے ایک ہیلے کے تین آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں جو کشتی چلانے

اور مچھلیاں پکڑنے کے باہر تھے۔ دریائی سفر میں ان کی بڑی ضرورت تھی۔ ان تینوں کے سردار کو ہم اس کے قبیلے کی رعایت سے موجود ہی کہتے تھے۔ باقی دو کے نام جوڑے اور فرنیڈ تھے۔

یہ ہفتہ بڑی مشکل سے گُٹا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آگیا جب ہمیں وہ لفاغہ کھولنا تھا۔ ہم تینوں بوآدے میں بید کی گریبوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں گول میز تھی جس پر لفاغہ رکھا ہوا تھا۔ لفافے پر پروفیسر چیلنجر کے بھدے خط میں لکھا تھا۔

”لارڈ جان روکسٹن اور ان کی جماعت کو ہدایت ہے کہ وہ اسے مناؤس میں 15 جولائی کو دن کے ٹھیک بارہ بجے کھولیں؟“ لارڈ جان روکسٹن نے اپنی گھڑی اتار کر لفاغے کے پاس ہی رکھ دی تھی۔ ”ابھی سات منٹ باقی ہیں؟“ لارڈ جان روکسٹن نے بیزاری سے کہا۔

مسٹر سمرلی نے مسکرا کر لفاغہ اٹھا لیا اور بولے۔ ”اگر چند منٹ پہلے بھی اسے کھول لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں جناب؟“ لارڈ جان نے کہا۔ ”پروفیسر نے ہمیں ہماری عزت کی قسم دلائی ہے۔ اس کا پاس تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”مسٹر سمرلی نے لفاغہ رکھ دیا اور کہنے لگے۔ ”اگر اس میں سے کوئی کام کی بات نہ نکلی تو میں نے تو سوچ لیا ہے کہ پہلے جہاز سے لوٹ جاؤں گا۔“

”وقت ہو گیا۔“ لارڈ جان نے جن کی نظریں برابر گھڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں، کہا اور لفاغہ اٹھا کر کھولنے لگے۔ میرا کلیجہ جانے کیوں منہ کو آنے لگا۔ لارڈ جان نے لفاغہ چاک کر کے اندر سے کاغذ نکالا اور ہمیں کھول کر اسے میز پر پھیلا دیا مگر بالکل سادہ۔ آنکھوں نے اسے اُلٹا تو دوسری طرف سے بھی وہ سادہ تھا۔ ہم تینوں احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ یکایک مسٹر سمرلی نے تمہقہ لگایا اور کہا۔

”لو بھٹی، مسئلہ حل ہو گیا۔ سادہ کاغذ اس بات کا ثبوت ہے کہ پروفیسر فراڈ ہے۔ اب ٹھنڈے ٹھنڈے واپس لوٹ چلو۔ پھر اس کم سخت جعل ساز سے سمجھیں گے؟“

ہم دونوں کو مسٹر سمرلی کی اس بات سے اتفاق تھا لیکن ابھی ہم نے اپنی رائے ظاہر بھی نہیں کی تھی کہ اچانک آواز آئی۔

”کیوں بھٹی، ہم بھی آجائیں؟“ ہم تینوں مارے حیرت کے اچھل پڑے۔ پروفیسر چیلنجر نے کھڑے تھے۔ ان کے سر پر تنکوں کا ہیٹ تھا جس میں بچوں کے ہیٹ جیسا رنگین رینتہ لگا ہوا تھا۔

”بھٹی معاف کرنا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اس وقت سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا لیکن راستے میں دیر ہو گئی۔“

یہ کہہ کر پروفیسر چیلنجر نے سب سے ہاتھ ملایا اور ایک گریسی

پر بیٹھ گئے جو ان کے بوجھ سے سر چرمانے لگی۔ ذرا دم لینے کے بعد آنکھوں نے کہا۔ "میں نے سوچا تم لوگوں کو کتنی ہی تفصیل سے ہدایات دے دوں، نقشے بنا دوں پھر بھی کیا پتا کہ تم وہاں پہنچ سکو گے یا نہیں۔"

اس کے بعد پروفیسر نے بڑی بے تکلفی سے اعلان کیا کہ اس وقت سے جماعت کے رہنما وہ خود ہیں اور کل روانگی ہے۔

پچوں کہ ہمیں دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت سفر کرنا تھا اس لیے لارڈ جان نے پہلے سے ایک بڑی سٹیج لائچ کرائے پر لے لی تھی۔ اس میں سوار ہو کر ہم مسلسل تین روز شمال مغرب کی طرف سفر کرتے رہے۔ دریا کا دہانہ اگرچہ اس جگہ سے کوئی ہزار میل دور تھا اس کے باوجود اس کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ دونوں طرف کنارہ نظر نہ آتا تھا۔

سفر کے چوتھے دن ہم پروفیسر چلینجر کی ہدایت پر ایک مضبوط دریا میں مڑ گئے جو اینرن میں آکر گرتا تھا۔ یہ نسبتاً کم چوڑا تھا جوں ہم آگے بڑھتے گئے، پاٹ چھوٹا ہوتا گیا۔ دو دن اور سفر کے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں پروفیسر نے اصرار کیا کہ ہم آتر جائیں اور لائچ واپس کر دی جائے۔ آنکھوں نے کہا۔ آگے چل کر چھوٹے چھوٹے آبتار ملتے ہیں

لہذا لائچ بے کار ہے۔"

یہاں پروفیسر چلینجر نے ایک مرتبہ پھر ہم سے قسم لی کہ ہم اس راستے کی تفصیل کسی موقع پر بھی ظاہر نہیں کریں گے۔ یہ قسم ملازموں سے بھی لی گئی تاکہ جو لوگ اخباریں یہ رپورٹ پڑھیں نقشے پر یہ راستہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس میں آنکھیں کا میا بنی نہیں ہوگی۔

جہراگت کو ہم نے لائچ چھوڑ دی اور مقامی باشندوں سے چار چھوٹی چھوٹی ہلکی کشتیاں حاصل کیں جو بانس کے ڈھانچوں پر کھال منڈھ کر بنائی گئی تھیں۔ اور ننھے ننھے آبتاروں سے آنکھیں گزارا جاسکتا تھا۔ سارا سامان کشتیوں پر لادا گیا اور مقامی باشندوں میں سے دو کو، جن کے نام اٹا کا اور اپی ٹو تھے، ساتھ لے لیا گیا۔ یہ دو آدمی پروفیسر چلینجر کے ساتھ پہلے بھی جا چکے تھے اب جو آنکھوں نے سنا کہ دوبارہ اسی خوفناک سفر پر جانا ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے لیکن گاؤں کے سردار کو کچھ رقم دے کر آنکھیں منا لیا گیا۔

یہاں تک کی رپورٹ میں لائچ کے ذریعے بھیج رہا ہوں کل ہم آگے روانہ ہوں گے اور آباد دنیا سے ہمارا رشتہ کٹ جائے گا۔

خاکوں کی کتاب والی سطح مرفوع اب ہمارے سامنے ہے اور

الگ الگ کشتیوں میں رکھا۔ میں چیلنجر والی کشتی میں تھا۔ دو دن تک ہم دریا میں سفر کرتے رہے جس کا پانی سیاہ تھا لیکن اس کے باوجود اس قدر شفاف تھا کہ تہ تک کی ہر چیز نظر آتی تھی۔ دریا سے میزان میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے آدھے معاون دریا سیاہ ہیں اور آدھے سفید۔ راستے میں دو ننھے ننھے آبشار ملے اور ہم خشکی پر آدھ میل کا چکر کاٹ کر اپنی کشتیوں کو نکال لے گئے۔ ہلکی کشتیوں کو اٹھا کر لے جانا نہایت آسان تھا۔ دریا کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے۔ میرے لیے وہاں کے درخت بالکل نئی قسم کے تھے۔ ان کے تنے بہت اونچے اور تنکے سیدھے چلے گئے تھے اور منہ اوپر اٹھا کر دیکھنے سے ہی ان کی شاخیں اور پتے وغیرہ نظر آتے تھے۔

یہاں بندر، سانپ یا جو دوسرے جانور تھے، وہ درختوں کے اوپر رہتے تھے، جہاں انہیں دھوپ مل سکتی تھی۔ کبھی کبھی دور کوئی دیکھ بھی نظر آ جاتا تھا۔ تیسرے دن صبح کو دور سے ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی جو ہوا کے رخ کے ساتھ کبھی آتی اور کبھی بند ہو جاتی۔

یہ کسی آواز سے ہے؟ میں نے پوچھا جس پر لارڈ جان نے لاپرواہی سے کہا: وحشی باشندوں کا اعلان جنگ ہے۔

گو مزے لڑنے کوئی پھوٹی انگریزی میں اس کی تصدیق کی اور کہا: یہ جنگلی ڈھول ہیں۔ جنگلی باشندے برابر ہم پر نظر رکھتے ہیں اور اب

ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ پروفیسر چیلنجر کا بیان غلط نہ تھا۔ اب تک ہم دیوار کی طرح سیدھی چٹانوں پر چڑھنے کا راستہ دریافت نہیں کر سکے ہیں۔ ہمارے ملازموں میں سے ایک آدمی زخمی ہو گیا ہے۔ اسے ہم واپس بھیج رہے ہیں اور وہی یہ خط لے جائے گا۔

آخری گاڈوں سے روانہ ہونے سے پہلے رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم لوگ ایک جھونپڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور حبشی ملازم زمو پورے پر تھا کہ اچانک گو مز جو کوئی پھوٹی انگریز بولتا تھا، چاقو لیے آیا اور اس نے زمو کو مار ہی ڈالا تھا کہ زمو بڑا پتھر تیرا تھا۔ اس نے کا دادے کو فارغی کر دیا اور چاقو چھین لیا۔ ہم لوگوں نے گو مز کو ڈانٹا اور دونوں میں مسلح صفائی کرا کے ہاتھ بلوا دیا۔

پروفیسر چیلنجر اور مسٹر سمرلی میں برابر جو نہیں ہوتی رہتی تھیں، جن سے ہم خوب لطف لیتے۔ سمرلی کو چڑانے کی عادت تھی لیکن پروفیسر بھی خوب چھتے ہوئے جواب دیتا۔ بعض دفعہ وہ بند ہو جاتی۔ بچوں کی طرح لڑ پڑتے جس پر مجھے حیرت ہوتی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ذہانت کا لولا منوار رکھا ہے۔

ہاں تو جب ہم گاڈوں سے روانہ ہوئے تو سارا سامان کشتیوں میں بھروا گیا اور ہم بارہ آدمی چھ چھ کر کے ایک ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ البتہ اتنی احتیاط کی کہ چیلنجر اور سمرلی

ہمارے آنے کی اطلاع آس پاس کے قبیلوں کو دی جا رہی ہے۔ وہ جب پاہیں ہمیں قتل کر سکتے ہیں۔

اور پھر اس دن سہ پہر کو — (میری ڈائری کے مطابق، آس روز منگل تھا اور اگست کی 18 تاریخ، اچانک ہر طرف سے ڈھول کی آوازیں آنے لگیں۔ واقعی ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کی لے بدلتی رہتی تھی۔ کبھی کوئی ڈھول اچانک خاموش ہو جاتا اور کچھ وقفے بعد تیزی سے بجنے لگتا۔ یہ ان لوگوں کا پیغام رہا کا طریقہ تھا۔

ان آوازوں سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

ہم جب پاہیں تمہیں قتل کر سکتے ہیں — جب چاہیں تمہیں قتل کر سکتے ہیں۔ آوازیں دن بھر سنائی دیتی رہیں اور ہم سب سپرو فیسر چلیخیر نے کہا۔ غور سے دیکھتے رہو۔ جہاں یہ سبز دیوار زردی مائل رہے۔ لیکن میں چلیخیر اور سمرنی کی بہادری کا قائل ہو گیا۔ وہ خطرہ دیوار سے ملے وہیں ہمیں رک جانا ہے۔

سے بے تعلق درختوں، بیلوں اور گھاس کی قسموں کے بارے میں بات کرتے رہے۔

رات کو ہم نے کنارے پر قیام کرنے کے بجائے دریا کے بیچ اپنی کشتیاں پتھروں سے باندھ دیں اور جاگتے رہے مگر کشتیوں کو اندر دھکیل کر لے گئے اور کوئی سو گز چلنے کے بعد ایک رہی اور صبح جب ہم آگے روانہ ہوئے تو یہ خوفناک آوازیں بدستے میں پہنچ گئے جس میں اٹھلا پانی تھا۔ اس کی چوڑائی بیس گز سے ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئیں۔

تین بجے سہ پہر کے قریب ہمیں پھر ایک آبتار بلا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پچھلے سفر کے دوران چلیخیر کا سامان ضائع ہو گیا تھا۔ ہم نے اپنا سامان اور ہلکی کشتیاں اٹھائیں اور کنارے پر چلنے لگے۔

کوئی ایک میل پیدل چل کر دوبارہ ہم نے کشتیاں پانی میں اتار دیں۔ اور دریائی سفر شروع کیا اور دس میل چل کر پھر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔

صبح کو جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو پروفیسر چلیخیر بڑی بے چینی سے بائیں طرف دیکھتے جا رہے تھے، جیسے کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ آخر ایک درخت آیا جو ترچھا ہو کر پانی پر ٹھک گیا تھا۔ اسے دیکھ کر انھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا کہ بس یہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر انکھی دنیا کا چور دروازہ ہے۔

ندی کے کنارے بانسوں کا گھنا ٹھنڈا ایک دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ پروفیسر چلیخیر نے کہا۔ غور سے دیکھتے رہو۔ جہاں یہ سبز دیوار زردی مائل رہے۔ لیکن میں چلیخیر اور سمرنی کی بہادری کا قائل ہو گیا۔ وہ خطرہ دیوار سے ملے وہیں ہمیں رک جانا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ بانسوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد ترنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ دونوں کے رنگ میں

بھرق تھا۔ پروفیسر چلیخیر کی ہدایت پر ہم ترنگوں کو ہٹاتے ہوئے اپنی کشتیاں پتھروں سے باندھ دیں اور جاگتے رہے مگر کشتیوں کو اندر دھکیل کر لے گئے اور کوئی سو گز چلنے کے بعد ایک رہی اور صبح جب ہم آگے روانہ ہوئے تو یہ خوفناک آوازیں بدستے میں پہنچ گئے جس میں اٹھلا پانی تھا۔ اس کی چوڑائی بیس گز سے زیادہ نہ رہی ہوگی۔ دونوں طرف بڑے گھنے درخت، بیلین، پلوے

اور جھاڑیاں تھیں اور چشے کے اوپر بھی دندختوں کی ٹہنیوں اور پتوں نے ایک چھت سی بنا دی تھی جس میں سے آسمان نظر نہ آتا تھا۔ گویا یہ سبز رنگ کی ایک گشاہ سبزنگ تھی جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔

یہاں جانور بھی بہت تھے۔ مچلی کھال والے بندر اپنے دودھ جیسے سفید دانت نکال نکال کر ہمارا استقبال کر رہے تھے اور دوسرے جانور بھی ٹرک ٹرک کر غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ وحشت نہیں تھی جو شکایلوں کے ڈر سے جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سبز رنگ میں یہ سفر تین دن جاری رہا۔ گوہر نے بتایا کہ گورڈ پوری کے ڈر سے مقامی باشندے بھی اس طرف نہیں آتے۔ گورڈ پوری یعنی جنگل کی بدروح، جس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

تیسرے دن شام کو ہمیں معلوم ہو گیا کہ اب کشتیوں کا سفر جاری نہیں رہ سکتا اس لیے کہ چشمہ برابر اٹھلا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ ہماری کشتیاں ریت میں دھنس گئیں۔ ہم انہیں گھسیٹ کر کنارے پر لے آئے اور یہیں رات بسر کی۔

صبح اٹھ کر ہم نے کشتیاں جھاڑیوں میں چھپا دیں اور گلہاڑ لے کر قریب کے ایک درخت کی چھال پر نشان لگا دیے تاکہ کشتیاں کو تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد ہم نے سامان کندھوں پر اور یوں ہمارے سفر کا سب سے مشکل حصہ شروع ہوا۔

یہاں ایک دل چسپ مائع پیش آیا۔ پروفیسر چلینجر خود ہی ہمارے لیڈر بن بیٹھے تھے اور ساری باتوں کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے تھے۔ حالاں کہ لندن سے روانگی کے وقت مسٹر سمرفی کو ٹیم کا لیڈر بنایا گیا تھا۔ جب ہمیں سامان خود اٹھا کر چلنا پڑا تو پروفیسر چلینجر نے ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے آئے، بیرو میٹر، کا ڈبا سمرفی کو دے دیا کہ اسے اٹھا لو۔ سمرفی کو یہ بات ناگوار گزری۔ انہوں نے کہا۔

جناب، کس حیثیت سے آپ مجھے یہ حکم دے رہے ہیں؟
ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے۔ چلینجر نے جواب دیا اور سمرفی ہلکے گئے۔ انہوں نے کہا جناب، میں آپ کو لیڈر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ چلینجر بھی اسی تلخ لہجے میں جواب دیں گے لیکن انہوں نے مسکرا کر کہا: آپ کے خیال میں میری پوزیشن کیا ہے؟ آپ ایک ایسے شخص ہیں جس کے جھوٹے سچ کا امتحان لینے کے لیے یہ کیٹیجی مقرر کی گئی ہے۔ آپ اپنے ججوں کے ساتھ چلیے اور بس۔

اب چلینجر نے اپنا تڑپ کا پتہ استعمال کیا اور وہیں گھاس پر بیٹھ کر بولے: تو ٹھیک سے آپ لوگ جاؤ۔ میرا جب جی چاہے گا آجاؤں گا۔ میں جب رہتا نہیں ہوں تو اس جماعت کی رہنمائی کیوں کروں؟

”خدا کا شکر ہے کہ وہاں دو سمجھ دار آدمی موجود تھے یعنی لارڈ جان روکسٹن اور میں۔ ہم نے متوجہ ہو کر کے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ سمرلی نے خاموشی سے چیلنجر کی رہنمائی قبول کر لی اور بیرو میٹر کا ڈیا اٹھا کر چلنے لگے۔ لیکن آپس میں بات چیت بند تھی۔

وہ چشمہ ایک پتلی سی نالی بن کر گھاس اور پودوں میں غائب ہو چکا تھا۔ یہاں بڑے بڑے پھروں کے جھنڈے کے جھنڈ بادل کی طرح اڑتے تھے۔ زمین پر اس قدر کافی تھی کہ گھٹنوں گھٹنوں تک ہمارے پیرا س میں دھنس جاتے تھے۔

دوسرے دن ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جو چڑھائی کی طرف جاتا تھا۔ جنگل ہلکا ہونے ہوتے قریب قریب ختم ہو گیا یا ستواؤں طرز کے دیو قامت درختوں کے بجائے اب کہیں کہیں پام کے جھنڈے تھے۔ ہم قطب نما اور دوسرے آلات کی مدد سے سفر کر رہے تھے۔

پروفیسر چیلنجر اور دو مقامی آدمی اس راستے پر پہلے بھی آچکے تھے۔ کبھی کبھی ان میں اس بات پر اختلاف ہو جاتا کہ کس طرف چلنا چاہیے۔ آخر دونوں مقامی آدمیوں کی رائے مانی جاتی اور بعد میں خود چیلنجر یہ مانتے کہ ہم ٹھیک راستے پر ہیں۔

زمین پتھریلی تھی اور چڑھائی مسلسل۔ پھر ایک پتھر بلا ڈھال بلا جھاتا طویل تھا کہ اسے پار کرنے میں دو دن لگے۔ اب پام کے جھنڈے ختم ہو چکے تھے اور جنگلی پھلوں کے درخت بکثرت تھے۔

کبھی کبھی کوئی صاف شفاف چشمہ بتنا اور ہم مچھلیاں پکڑ کر خوب مزے دار دعوت اڑاتے۔

نودن میں ہم نے کوئی ایک سو بیس میل پیدل سفر کیا۔ اب ہمیں بانس کا جنگل بلا جھاتا گھنا تھا کہ سامان لے کر گزرنا مشکل تھا۔ ہم کھلاڑیوں سے بانس کاٹ کاٹ کر راستے بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اس جنگل کو عبور کرنے میں پورا دن لگا۔ مغرب کے بعد اس سے باہر نکلے اور وہیں ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ صبح کو جب روشنی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ سامنے پھر چڑھائی ہے اور جگہ جگہ اونچی اونچی کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ بہت دور وکیل مچھلی کی پیٹھ کی طرح خم کھاتی ہوئی سیاہی مائل پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ تیسرے پتھر تک ہم نے یہ پہاڑی پار کر لی اور ایک وادی میں پہنچ گئے جس کے دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں ایک واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پروفیسر چیلنجر، جو سب سے آگے تھے، اچانک دائیں طرف دیکھ کر چلائے۔ ”وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔“

ہم سب نے دیکھا۔ یہ بھورے رنگ کا بہت بڑا پرندہ تھا جو زمین سے اڑا تھا اور کم بلندی پر پرواز کرتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ ”دیکھا۔“ چیلنجر نے سمرلی سے کہا جس کا اٹھوں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ ”ہاں دیکھا۔“

ملازمین میں سے جوڑے بانسوں کا جنگل پار کرتے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے بانس سے زخمی ہو گیا تھا۔ تیز نوک اس کا بازو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ خط میں اسی کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی قسط انتہائی سنسنی خیز ہوگی۔

موت کے جنگل میں

آف میرے خدا۔ ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہم جن مصیبتوں میں گرفتار ہیں ان کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے ہمیں ساری زندگی اس عجیب و غریب جگہ گزار دینا پڑے۔ میں تو جتنا سوچتا ہوں اتنی ہی مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم جس جگہ ہیں وہاں کا صحیح صحیح پتا اور راستے کا نقشہ بنا کر بھیج دیں تاکہ ہمارے دوست امدادی جماعت بھیج کر ہمیں بچالیں کیونکہ ہم اگر ایسا کریں بھی تو خط جانے اور امدادی جماعت آنے تک ہماری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ میرے مینوں ساتھی نہایت ذہین اور جرات والے لوگ ہیں۔ انہی سے آخری آس ہے لیکن جب میں ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار دیکھتا ہوں تو میرا جی ڈوبنے لگتا ہے۔ ہم مہذب دنیا سے اس طرح کٹ گئے ہیں جیسے چاند پر پہنچ گئے ہوں۔

آئیے اب ذرا تفصیل سے بتاؤں کہ ہم اس حالت کو کیسے چھوڑیں۔

پچھلے خط میں میں نے بتایا تھا کہ ہم اس سطح مرتفع سے صرف سات

میل کے فاصلے پر ہیں جس کا ذکر چلیخبر نے کیا تھا اور جہاں ہیں جانا تھا جب ہم اُس کے اور قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ چھتاق کی یہ دیوار کم سے کم ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے اوپر کنارے پر گھنی جھاڑیاں اور ان کے پچھے بلند درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

ہم نے چھتاق کی دیوار کے بالکل نیچے اپنا کیمپ لگا دیا۔ دیوار تو سیدھی ہوتی ہے مگر یہ باہر کی طرف جھکی ہوئی تھی، اس وجہ سے چڑھنا ناممکن تھا۔ سطح مرتفع سے تقریباً ملی ہوئی ایک اور پہاڑی تھی جو اتنی ہی بلند تھی۔ غالباً یہ کسی زمانے میں سطح مرتفع کا ہی حصہ رہی ہوگی لیکن بعد میں ایک چوڑی دلدل نے اسے جدا کر دیا۔ اس پہاڑی پر ایک بہت اونچا اور مضبوط درخت بھی تھا۔ پروفیسر چلیخبر نے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں نے اس پر ٹیروڈ کٹائل کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں نے کچھ دور چڑھنے کی کوشش کی اور پھر اُس پر گولی بھی چلائی مگر وہ زخمی ہونے کے بعد اُس کے سطح مرتفع پر چلا گیا۔

اس ذکر پر پروفیسر سمرلی کے چہرے پر شیمانی کے آثار نمودار ہوئے شاید اب انھیں پروفیسر چلیخبر کی کہانی پر اعتبار آتا جا رہا تھا۔ چلیخبر نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا: "میں جب ٹیروڈ کٹائل کتا ہوں تو سمرلی اُسے بگلا سمجھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر چلیخبر نے جھبک کر انھیں سلام کیا اور سمرلی نے شرمندہ

ہو کر منہ پھیر لیا۔

آخر اُوپر چڑھنے کے طریقوں پر غور کرنے کے لیے ہم نے ایک میٹنگ بلائی جس کی صدارت پروفیسر چلیخبر نے کی۔ انھوں نے کہا۔ پچھلے سفر کے دوران میں نے اس پر چڑھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ جب میں ناکام ہو گیا تو کسی اور کے کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں کوہ پیمائی کے فن میں بھی ماہر ہوں۔

اُن کے اس دعوے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ پروفیسر نے کہا۔ پچھلی مرتبہ میرے پاس کوہ پیمائی کا سامان نہیں تھا لیکن اس دفعہ میں وہ بھی لایا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ سطح مرتفع پر تو نہیں البتہ اس الگ پہاڑی پر چڑھا جا سکتا ہے۔

پروفیسر چلیخبر نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے سطح مرتفع کے مشرق میں کوئی چھ میل تک سفر کر کے دیکھا تھا کہ شاید اُوپر جانے کا کوئی راستہ نظر آجائے یا ایسی کوئی جگہ مل جائے جس سے چڑھنا ممکن ہو مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس پر سمرلی نے کہا۔

آپ مشرق کی طرف گئے تھے تو کیوں نہ ہم مغرب کی طرف جا کر دیکھیں۔ شاید کوئی صورت نکل آئے۔

لاڈ جان روکٹن نے اپنی رائے ظاہر کی۔ کیوں نہ ہم کسی ایک سمت سفر کریں اور پوری سطح مرتفع کا چکر لگا کر اسی جگہ واپس آجائیں۔

اس طرح کوئی نہ کوئی جگہ ایسی مل ہی جائے گی جہاں سے اُوپر چڑھ جاسکتا ہو۔

اس پر پروفیسر چلیجیر نے کہا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی راستہ نہ ملے گا۔ اگر ہوتا تو اُوپر کے جانور نیچے آگئے ہوتے اور پھر اس علاقے اور ہماری دنیا میں کوئی فرق باقی نہ رہ جاتا۔

یہ سن کر ہم سب بائوس ہو گئے لیکن چلیجیر نے پھر کہا۔ چڑھنے کا راستہ نہ سہی، اُوپر مہینچنے کا کوئی حقیقی راستہ ضرور ہو گا۔
”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ سمرلی نے کہا۔

اس لیے کہ ہم سے پہلے میل و ہائیٹ وہاں پہنچ چکا ہے اور اس نے اُس عجیب و غریب جانور کی تصویر وہیں پہنچا رکھی۔

”یہ کوئی دلیل نہیں۔“ سمرلی نے سر ہلا کر کہا۔ جو بات ثابت نہیں ہوئی اس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس کی اس سطح مرفوع کا وجود میں نے تسلیم کر لیا اس لیے کہ یہ یہ سامنے ہے لیکن اس پر عجیب و غریب جانوروں کا ہونا میں وقت تک تسلیم نہیں کر سکتا جب تک ثبوت نہ مل جائے۔
یہ سن کر چلیجیر کو غصہ آ گیا۔ اُنہوں نے کہا۔

”تمہارے کسی چیز کو ماننے یا نہ ماننے کی کوئی اہمیت نہیں کیا کم ہے کہ تمہاری حقیقہ عقل نے اس سطح مرفوع کا وجود تسلیم

لیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اچانک چلیجیر اچھل کر کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے سمرلی کی گردن پکڑ کر اُسے گھمایا اور کہا۔ ”لو، وہ دیکھو۔“

ہم سب نے دیکھا۔ حقیقاً کی دیوار کے اُوپر کے حصے پر جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں، ایک بہت بڑا سانپ بلکہ اڑدھا لنگ رہا تھا۔ اس کا سر چپٹا سا تھا۔ کوئی ایک منٹ تک وہ وہاں کلبلاتا رہا اور پھر ایک منٹ بعد رینگ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

پروفیسر چلیجیر سمرلی کی گردن پکڑے اُن کا منہ اُوپر اٹھائے کھڑے رہے اور سمرلی نے بھی اپنی محویت میں اس کا خیال نہ کیا لیکن جب سانپ چلا گیا تو اُنہوں نے چلیجیر کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔
”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

چلیجیر نے کہا۔ ”آئید ہے اب میرے دوست کو یقین آ گیا ہو گا کہ اُوپر زندگی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔“

بہر حال تھوڑی سی بحث کے بعد اس پر اتفاق ہو گیا کہ مغرب کی سمت سفر کیا جائے اور اُوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کیا جائے۔
زمین بہت پتھریلی اور بڑے بڑے پتھروں سے اٹی پڑی تھی اس لیے ہمارے آگے بڑھنے کی رفتار کافی دھیمی تھی۔

کچھ دُور چل کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ یہاں ہم نے ایک کیمپ کے آثار دیکھے۔ گوشت کے خالی ڈبے، ٹین کھولنے

کا ایک زنگ آلود اور دوسرا سامان پڑا ہوا تھا۔ ایک لڑکا
مڑا اخبار بھی تھا جس کی تاریخ پڑھی نہ جاسکی۔

”یہ سامان میرا نہیں ہے۔“ چلیخبر نے کہا۔ یہاں میپل وہائٹ
نے کیمپ لگایا ہوگا۔“

لارڈ جان بڑے غور سے اس جھاڑی کی طرح کے درخت کو
دیکھ رہے تھے جس کے سائے میں یہ کیمپ لگایا گیا تھا۔ انھوں نے
کہا۔ ”دیکھو۔ یہ نشان سمت بتانے کے لیے لگایا گیا ہے۔“

لکڑی کا ایک نوکیلا تختہ رکیل سے درخت میں ٹھونکا گیا تھا۔
جس کی نوک کا رخ مغرب کی سمت تھا۔ یقیناً یہ نشان بعد میں آنے
والوں کی رہنمائی کے لیے لگایا گیا تھا۔

ہم خوشی خوشی آگے چلے۔ کچھ دودھ چل کر چٹان کی جڑ میں بانسوں
کا ایک جھنڈ ملا۔ بیس بیس فٹ اونچے، نوکیلے بانس برچھوں کی
طرح کھڑے تھے۔ گنجان جھنڈ کا چکر لگاتے ہوئے اچانک میری نظر
جھنڈ کے درمیانی حصے پر پڑی۔ کوئی سفید سفید چیز نظر آ رہی تھی
نے غور سے دیکھا تو دو رنگے کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک انسانی ڈھانچہ
تھا اور پورے کا پورا آپس میں جڑا ہوا تھا۔ صرف کھوپڑی الگ
ہو گئی تھی جو کچھ ناصیے پر پڑی تھی۔

ہم نے گلہاڑیوں سے بانس صاف کیے اور وہاں تک پہنچے
ڈھانچے کے آس پاس چند چلیخبرے تھے جو کبھی اس کا لباس

ہوں گے۔ پیروں میں بوٹ تھے جو سوکھ کر پتھر کی طرح سخت ہو گئے
تھے۔ ان سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی یورپی نسل کا آدمی تھا۔ نہری
گھڑی، قلم اور چاندی کا سگریٹ لائٹر بھی پڑا ہوا تھا۔ جس پر
’ج۔ ک۔ کھدا‘ ہوا تھا۔ ان چیزوں کی حالت بتا رہی تھی کہ انھیں
یہاں پڑے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

”یہ کون بد نصیب ہو سکتا ہے؟“ لارڈ جان نے ایک ٹھنڈی ناس
لے کر کہا۔

پروفیسر چلیخبر نے کہا۔ ”پارا میں میں نے چھان بین کی تھی تو سیا چلا
تھا کہ میپل وہائٹ کے ساتھ ایک اور امریکی تھا جس کا نام جمیز کولورڈ
تھا۔“

ابناج۔ ک۔ کا مطلب واضح تھا۔ یقیناً یہ جمیز کولورڈ ہی کا ڈھانچہ
تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کی موت کس طرح ہوئی۔ بانس اس کے ڈھانچے
میں پروٹے ہوئے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اوپر سے گرا ہے۔
پھر بڑیاں بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھیں جو ایک ہزار فٹ کی
چاندی سے پتھروں پر گرنے کا ثبوت تھا۔ ہم نے اوپر دیکھا۔ پہاڑی
اوپر کا بسرا باہر کی طرف مٹھکا ہوا تھا۔ مجھے ایک بھر جھری سی آئی
مخوف کی ایک لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

لارڈ جان نے کہا۔ ”وہ وہاں سے گرا ہے یا کسی نے اسے
ماکر پینک دیا ہے۔“

تھی۔ دوسرے لمحے پرندہ غائب ہو گیا اور ساتھ ہی وہ مزے دار
گوشت بھی جو ہم بھون رہے تھے۔ ہم چاروں گم سم بیٹھے رہ گئے
سب سے پہلے سمرلی نے خاموشی توڑی اور بڑی سنجیدگی سے بھرائی
ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے معاف کر دیجیے پردیسر چلیخیر۔ میں غلطی پر تھا۔ اُمید ہے کہ آپ
پچھلی باتیں بھول جائیں گے۔“

پردیسر چلیخیر نے جلدی سے سمرلی سے ہاتھ بلا لیا۔ اس طرح ہم نے
پہلی مرتبہ ٹیرڈ کٹائل پرندہ دیکھا۔ کھانے سے محروم رہ جانے کا اس
لیے افسوس نہ تھا کہ اسی بہانے ہمارے دوسرا تھی آپس میں دوست
بن گئے۔

پھر بھی ہم سب کا خیال تھا کہ سطح مرتفع پر اگر پرانے زمانے کے
جانور ہیں بھی تو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگلے تین روز تک
ہم نے کوئی جانور نہیں دیکھا۔ اس عرصے میں ہم نے ایک طویل چکر
لگایا۔ پتا چلا کہ سطح مرتفع کے ایک طرف دلدل ہے جس میں طرح
طرح کی چڑیاں اور زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک
ریگستان ہے جہاں کوئی جاندار نہیں۔ بہر حال چڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہ
آیا۔

میں نے کہا سطح مرتفع پر بارش ہوتی ہوگی اور پانی بہہ کر نیچے
بھی ضرور آتا ہوگا۔ اس لیے پانی نے چٹانیں کاٹ کر کوئی راستہ

خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم خود پتھروں کے ریلے میں نہ دب جائیں۔ پتھر
کا دریافت کیا ہوا راستہ شاید زلزلے یا کسی اور سبب سے بند
ہو گیا تھا۔ آخر میں واپس ہونا پڑا اور مایوسی نے تھکن کا احسا
دس گنا بڑھا دیا۔

مچھلی ہم شگاف سے باہر نکلے ایک بہت بڑا پتھر آگرا اور ہم
لوگ بال بال بچ گئے۔ ہم نے اوپر دیکھا مگر وہاں بالکل خاموشی تھی
جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نے جان بوجھ کر ہمیں نشانہ بنانے کی
کوشش کی تھی یعنی اوپر کوئی انسان موجود تھا۔ ہم سب سوچ میں
پڑ گئے۔

کیمپ واپس پہنچ کر ہم نے صورت حال پر غور کیا اور اس نتیجے
پر پہنچے کہ مغرب کی جانب سفر جاری رکھا جائے۔ ہم یہ باتیں کر رہے
تھے کہ چھوٹی نسل کا ایک جنگلی جانور بھاگتا ہوا گزرا۔ لارڈ جان
پھرتی سے بندوق اٹھا کر داغ دی اور اسے گرا لیا۔ آدھا تو ہم نے
ملازموں کو کھانے کے لیے دے دیا اور باقی آدھے کو ایک ککڑی
میں پرواگ پر اپنے لیے سینکنے لگے۔

اچانک ایسی آواز آئی جیسے کوئی ہوا ٹی جہاز اڑتا ہوا نیچے
آ گیا ہو۔ پھر بغیر بال یا رومیں والے چمڑے کے پر ہم سب پر چھا
مجھے تو اتنا یاد ہے کہ اس پرندے کی گردن سانپ جیسی تھی۔
مترخ لالچی آنکھیں تھیں اور منہ میں سفید باریک دانتوں کی لمبی

ضرور بنا دیا ہوگا۔

پروفیسر چلیجی نے کہا: اسے کہتے ہیں عقل بڑی کہ بھینس۔ اے
بھئی ہم نے خود دیکھ لیا کہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر عقل لڑانے سے
کیا حاصل۔ پانی تو کسی چھیل میں بھی جمع ہو سکتا ہے۔
اس پر سمرلی نے کہا۔ اگر اوپر کوئی چھیل ہے تو وہ کسی آتش خفا
پھاڑ کے بنائے ہوئے وسیع گڑھے میں ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ
پانی وہیں سے ریس ریس کر دلدل میں پہنچ رہا ہو۔
”یا پھر تننا پانی برتا ہو بجا پ بن کر اڑ جاتا ہو۔“ چلیجی نے
خیال ظاہر کیا اور ہم لوگ بڑی دیر تک ان دونوں عالموں کی باتیں
سننے رہے جو ہمارے پلے نہ پڑیں۔

چھ دن بعد پوری سطح مرتفع کے گرد چکر لگا کر ہم تھکے ہارے
اپنے کیمپ میں واپس آ گئے۔ اب اوپر چڑھنے کا کوئی امکان نہ
تھا۔ وہ راستہ جو میل دہائیٹ نے اختیار کیا تھا اب بند ہو چکا تھا۔
ہمارے پاس کھانے پینے کے سامان اور کارٹوسوں کی کمی نہ
تھی۔ لیکن کوئی دو مہینے بعد برسات شروع ہونے والی تھی۔ اگر ہم
ان سخت چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بناتے تو دو مہینے میں پورے
کام کا دسواں حصہ بھی مکمل کرنا مشکل تھا۔

ایک روز ہم کیمبل اڈرہ کر سونے کے لیے لیٹے تو میں نے دیکھا
کہ چلیجی کسی موٹے مینڈک کی طرح آگ کے پاس دوزانو بیٹھے ہوئے

ہیں۔ اُن کا سر بائوسی سے سینے پر جھکا ہوا تھا۔

لیکن صبح کو ہم سو کر اٹھے تو ایک دوسرا ہی چلیجی نظر آیا۔ اُن
کے انگ انگ سے خوشی بھوٹی پڑ رہی تھی۔ ناشتے پر آنکھوں کے
کما۔ دوستو، مجھے مبارک باد دو۔ بلکہ سب ہی کو مبارک ہو۔ مسئلہ
حل ہو گیا۔

”وہ کیسے؟“ ہم نے پوچھا۔ جس پر چلیجی نے اُس نوکیلی پہاڑی کی
طرف اشارہ کیا جو اصل سطح مرتفع سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ یہ
دیکھ کر ہمارے چہرے جو لمحہ بھر پہلے بتاش ہو گئے تھے پھر ماند پڑ
گئے۔ لارڈ جان نے کہا۔

”مان لیا کہ اس پہاڑی پر چڑھا جا سکتا ہے لیکن فائدہ کیا؟
اس کی چوٹی سطح مرتفع سے اتنی دور ہے کہ ہم کسی طرح وہاں نہیں
پہنچ سکتے۔“

”اوپر پہنچ کر میں تباؤں گا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں ہے، انسانی
ذہن حل نہ کر سکے۔“ چلیجی نے کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔

ناشتے کے بعد ہم نے کوہ پیماٹی کا سامان کھولا۔ اُس میں سے
سب سے مضبوط اور سب سے ہلکی رستی نکالی جو ڈیڑھ سو فٹ
کے لگ بھگ ہوگی۔ گدا لیں اور دوسرا سامان بھی لیا۔ لارڈ جان کو
کوہ پیماٹی کا خاصا تجربہ تھا۔ سمرلی بھی اناڑی نہیں تھے۔ چلیجی تو ہر
فن مولا تھے ہی۔ لے دے کے ایک میں ہی پھنسی تھا۔ بہر حال

چڑھائی شروع ہوئی۔ شروع میں یہ کام آسان نکلا لیکن کبھی کبھی ایسے لمحے ضرور آئے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہونے لگی۔ آدھا راستہ طے ہو گیا تو چڑھائی بہت مشکل شروع ہو گئی اور آخری پچاس فٹ تو ہم نے انگلیوں کے بل لٹک لٹک کر اور چھوٹی چھوٹی لگروں پر صرف پنجے ٹکا کر طے کیے۔ بلکہ مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ چلیجیر نے، جو سب سے پہلے اوپر پہنچے تھے، مجھے اور سمرلی کو کھینچ کر وہاں پہنچا یا ورنہ ہم لوگ کبھی نہ چڑھ سکتے۔

اس مخروطی پہاڑی کی چوٹی کوئی پچاس فٹ قطر کی تھی۔ اس پر گھاس آگی ہوئی تھی اور کنارے کے پاس ایک مضبوط لبادہ تھکا۔ ہوش بٹکانے آنے کے بعد جو چیز سب سے پہلے میں نے دیکھی وہ نیچے کا خوش نما منظر تھا۔ برازیل کا پورا میدان نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی اس منظر سے لطف اٹھا ہی رہا تھا کہ پردیسر چلیجیر کا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر پڑا۔

”ادھر دیکھو میرے دوست پیچھے مڑ کر دیکھنا بزدلی ہے۔ نظر ہمیشہ منزل کی طرف رکھو۔“

میں نے مڑ کر دیکھا تو سطح مرتفع میرے بالکل سامنے تھی اور اس کی بلندی مخروطی پہاڑی کے بالکل برابر تھی۔ اسے اتنا قریب پا کر یقین نہ آ رہا تھا کہ اس پر چڑھنے کی خاطر ہم نے کیا کیا جتن کیے

تھے اور پھر نا کام رہے تھے۔ دونوں کا ناصباہ کوئی چالیس فٹ رہا ہو گا۔ میں نے ایک ہاتھ درخت کے گرد ڈال دیا اور جھبک کر دیکھا۔ نیچے ہمارے ملازم ننھے ننھے کھلونے جیسے نظر آ رہے تھے۔ مجھے جگر سا آنے لگا اور میں فوراً بیدھا ہو کر سنبھل گیا۔

اتنے میں پردیسر چلیجیر کی آواز آئی: ”یہ درخت دیکھا؟“

میں نے جلدی سے درخت کو غور سے دیکھا۔ چکنی چھال اور ابھری ہوئی رگوں والے چھوٹے چھوٹے پتے۔ بلاشبہ یہ سفیدے کا درخت تھا۔ اپنے وطن کے درخت کو یہاں دود پر دیں میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چلیجیر نے کہا۔

”اس درخت کا ہمارے ملک سے رشتہ ہے اور یہی ہماری مشکل بھی حل کرے گا۔“

”کیا اسی کا پل بنے گا؟“ لارڈ جان نے مارے خوشی کے چیخ کر کہا اور ہم سب کی مایوسی اس میں بدل گئی۔

چلیجیر نے ڈینگ ماری: ”چلیجیر کو اس وقت ترکیب سوجھتی ہے جب کوئی امید باقی نہ رہے۔ رات ہم مایوس تھے لیکن صبح میرے دماغ نے کام کیا اور آخر اس مسئلے کا حل ڈھونڈ ہی نکالا۔“

”کیا کہنے ہیں تمہارے دماغ کے؟“ سمرلی نے داد دی۔

چلیجیر اپنے کندھے پر ایک گلاباڑی لٹکا کر لائے تھے۔ اب انہوں نے وہ گلاباڑی اتار کر مجھے دی اور کہا: ”لو صاحبزادے۔ تم ہم

سب میں جوان اور جاندار ہو۔ یہ سنبھالو اور جس طرح میں کہوں اُس طرح درخت کو کاٹو۔

درخت قدرتی طور پر سطح مرتفع کی جانب ہی جھکا ہوا تھا۔ اُس کی اُونچائی کوئی ساٹھ ستر فٹ تھی۔ گویا طریقے سے گرایا جاتا تو اچھا خاصا پل بن جاتا۔ چیلنجر جہاں جہاں تباتے رہے، میں گھساڑی سے نیپے تکی چوٹ مارتا رہا۔ جب میں تھک گیا تو گھساڑی لارڈ جان نے سنبھال لی۔ یونہی باری باری ہم درخت کاٹتے رہے۔ اچانک درخت ایک زرد دار چمچراہٹ کے ساتھ گرا اور اُس کی ٹہنیاں سطح مرتفع کی گھنی جھاڑیوں میں الجھ گئیں مگر تے ہوئے اُس کا کٹا ہوا حصہ بھی کنارے کی طرف گر پڑا اور ایک لمحے کے لیے تو ہمیں یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ درخت نیچے جا گرے گا اور ہماری ساری محنت اکارت جانے گی لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ لگڑ سے چند اینچ ادھر ہی رک گیا اور اس طرح اس نامعلوم دنیا سے ہمارا تعلق قائم ہو گیا۔

ہم سب نے ایک لفظ کے بغیر باری باری چیلنجر سے ہاتھ ملایا اور آنکھوں نے بھی اپنا تنکوں والا بیچگانہ ہیٹ آنا کر جھک جھک کر ایک ایک کا شکر یہ ادا کیا۔ اس کے بعد وہ بولے: "نئی دنیا میں پہلا قدم رکھنے کا فخر بھی مجھی کو حاصل ہونا چاہیے۔"

ہٹھریے جناب! یہ لارڈ جان کی آواز تھی۔ آنکھوں نے درخت

کی جانب بڑھتے ہوئے پروفیسر کا کندھا پکڑ کر انھیں روک لیا تھا۔ پروفیسر چیلنجر کا سر مجھے کی طرف ڈھلکا اور ڈاڑھی آگے نکل آئی جو ان کے غصے کی مخصوص علامت تھی۔ لارڈ جان نے کہا۔

مجناب جہاں تک سائنس کا معاملہ ہے میں آپ کو رہنما ماننا نہیں اور آپ کے سچھے آنکھ بند کر کے چلنے کو تیار نہیں لیکن جب میرے شعبے کا سوال پیدا ہو تو آپ کو میرے سچھے چلنا چاہیے!

آپ کا شعبہ؟ چیلنجر نے چنگھاڑ کر کہا جس پر لارڈ جان بولے۔ ہم ایک نئے ملک پر چڑھنا شروع کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہاں دشمن موجود ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدم خور ان بڑی بڑی جھاڑیوں کے سچھے چھپے ہوئے ہوں۔ اس لیے ہمیں ان کی خوراک بننے سے پہلے دوراندیشی سے کام لینا چاہیے!

آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ چیلنجر نے بے بسی سے پوچھا۔ جس کے جواب میں لارڈ جان نے کہا۔

میں اور سیلون دوبارہ نیچے جائیں گے اور وہاں سے چار اونٹنیوں اور گومز اور دوسرے لوگوں کو لے کر واپس آئیں گے۔ اس کے بعد ایک آدمی پل پار کر کے اس طرف جائے گا اور ہم سب یہاں اونٹنیوں تانے اُس کی حفاظت کے لیے تیار کھڑے رہیں گے۔

پروفیسر چیلنجر کے ہوئے درخت کے سرے پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگے میرا اور سمرلی کا خیال تھا کہ جہاں اتنی احتیاط درکار ہو وہاں لارڈ جان

ہی کو رہنا ہونا چاہیے۔

چنانچہ کثرتِ راستے سے اس مثلے کا فیصلہ کیا گیا اور لارڈ جان نیچے اتر آئے۔ رستی درخت کی جڑ میں بندھی رہی۔ ہم نے نہ صرف بندوبست اور سارے کارٹوس لیے بلکہ کھانے پینے کے سامان کی گٹھریاں اور تھیلے بھی لے لیے۔ اور دوبارہ اوپر پہنچ گئے۔

مستر چلینجر، اب چونکہ سارے انتظامات مکمل ہیں۔ لارڈ جان بولے۔ اس لیے اس نامعلوم دنیا میں پہلا قدم رکھنے کا اعزاز آپ ہی حاصل کریں۔

یہ سن کر چلینجر اتنے خوش ہوئے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے جھک جھک کر سلام کیے اور شکریہ ادا کیا۔ پھر درخت پر دونوں جانب ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے کے بعد کھسکا شروع کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر کپکار کر کہا: آخر کار ہم نے پالا مار ہی لیا۔

میرا خیال تھا کہ چلینجر کے پیچھے ابھی کوئی درندہ یا وحشی جھاڑیوں سے نکلے گا مگر کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ البتہ رنگ برنگے پروں والی ایک چھوٹی سی چڑیا اس کے قدموں کے پاس کی جھاڑیوں سے نکل کر آگئی۔

اب سمرلی پارا اترے۔ وہ اپنے ساتھ دو رائفلیں لے گئے تھے تاکہ ایک چلینجر کو دے دیں۔ اس کے بعد یہ ٹیم میں نے سر کی اور اس کی احتیاط کی کہ کہیں نیچے نظر نہ پڑ جائے ورنہ میرا تو سر ہی چکرا جاتا۔

جب میں اس کنارے پر پہنچ گیا تو سمرلی نے پہلے اپنی بندوق مجھے تھما دی اور جب اس کا سہارا لے کر میں اور قریب پہنچا تو انھوں نے ہاتھ دے کر مجھے کھینچ لیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ لارڈ جان کھڑے ہو کر اطمینان سے اس چالیس فٹ لمبے لٹھے پر چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔

گویا اب ہم چاروں اس نامعلوم دنیا میں پہنچ چکے تھے جس کو دریا تو حاصل میل و بائیسٹ نے کیا تھا لیکن اس کے اندر قدم رکھنا ہمارا نصیب میں تھا۔ مگر فتح مندی کا یہ لمحہ ہی ہماری تباہی کا آغاز تھا۔ ہم مخروطی پہاڑی کی طرف پیٹھ کر کے گنجان جھاڑیوں میں بمشکل سچا س گز گئے ہوں گے کہ کُنٹ کی جانب سے کسی بہت بڑی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ ہم دوڑ کر کنارے پر واپس آ گئے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہمارا پل غائب تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو اتنی بلندی سے گرنے کی وجہ سے مضبوط تنے کے پرچھے اڑ چکے تھے۔

درخت مخروطی پہاڑی کے کنارے پر ذرا سا لٹکا ہوا تھا اس کا کنارہ ٹوٹ گیا اور وہ گر پڑا لیکن اسی لمحے مخروطی پہاڑی پر سے گرنے کی آواز سنائی دی وہ چلا رہا تھا۔

”لارڈ روکسٹن — لارڈ جان روکسٹن“

”کیا ہے؟“ لارڈ جان نے کہا جس کے جواب میں گوہرنے مقدمہ لگا کر کہا: ”انگریز گئے۔ اب تم وہیں رہو۔ میں بہت دن سے موقع کی

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ سمرلی نے نیچے میدان کی طرف اشارہ کیا اور ہم نے دیکھا کہ مینوئل بے تحاشا بھاگ رہا ہے جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو اور پھر ہم نے دیو قامت زرمبو کو اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ زرمبو نے جلد ہی مینوئل کو جالیا اور گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس کے بعد زرمبو بھاگا ہوا سطح مرتفع کے قریب آیا اور ہاتھ پلا ہلا کر ہمیں اپنا کارنامہ بتانے لگا۔

دونوں غدار اپنے کیے کی سزا پا چکے تھے لیکن ہم اس سطح مرتفع پر قید ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے نیچے نظر ڈالی۔ دُور تک وہ پیلا پیلا بانسوں کا جنگل تھا جسے ہم نے پار کیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ جگہ تھی جہاں ہم نے اپنی کشتیاں چھپائی تھیں۔ اس سے پیچھے وہ علاقے تھے جہاں مُتذب لوگ آباد تھے اور ہم اس غیر آباد علاقے میں ان سب سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کٹ گئے تھے۔

نیچے زرمبو ہاتھ پلا ہلا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم نے غور سے سنا تو یہ الفاظ سنائی دیے: اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ جو کہیں میں وہی کروں گا۔

یہ سوال جتنا آسان تھا اس کا جواب اتنا ہی مشکل تھا۔ زرمبو نے پھر کہا: میں یہاں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ لیکن یہ مقامی لوگ واپس جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں گورڈ پوری رہتی ہے۔

تلاش میں تھا۔ یہاں چڑھنا مشکل تھا لیکن اب اترنا ناممکن ہے۔ خوب پھنسے ہوئے تم۔

ہم سب اس واقعے پر ہٹا بکا رہ گئے تھے اور سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا؟ اتنے میں گورمز نے پھر کہا: غار سے نکلنے وقت میں تم پر پتھر پھینکا تھا لیکن تم بچ گئے۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ اب تم تڑپ تڑپ کر مر دو گے۔ بسک بسک کر جان دو گے۔ تمھاری ہڈیاں تک کسی کو نہیں ملیں گی اور جب تم مرنے لگو تو گورمز کو یاد کر لینا جسے پار برس ہوئے تم نے گولی مار دی تھی۔ وہ میرا بھائی تھا۔ آج میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا ہے۔

گورمز نے یہ جملہ رستی میں ٹنک کر فخر دہی پہاڑی پر سے صرف اپنے سر نکال کر کہا تھا اور اس کے بعد وہ تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اپنے خیال میں وہ بالکل محفوظ تھا مگر لارڈ جان نشانے بازی میں تین تیرا کے چیمپین تھے۔ انھوں نے بندوق اٹھا کر شہت باندھی اور دوسرے ہی لمحے کٹے ہوئے درخت کی جڑ میں بندھی ہوئی رسی کو اڑا دیا۔ گورمز کی وہ چیخ مجھے زندگی بھر یاد رہے گی۔ بلاشبہ اسے اپنی شرارت کی سزا مل گئی تھی لیکن ہماری واپسی کا راستہ بہر حال بند ہو گیا تھا۔ لارڈ جان نے کہا۔

گورمز اتنے بڑے درخت کو اکیلا نہیں گرا سکتا تھا۔ مینوئل اس کے ساتھ ہوگا۔ افسوس وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

سطح تر تفع پر اس کنارے کوئی بڑا درخت ہوتا تو ہم اُسے گرا کر رکھ بنا لیتے۔
مگر پتاس گز تک کوئی ایسا درخت نہیں ہے۔ صرف جھاڑ جھنکار
ہیں۔ ہم چار آدمیوں میں مل کر بھی اتنی طاقت نہیں کہ دور سے کوئی
درخت کاٹ کر اور اُسے گھسیٹ کر کنارے پر لائیں اور اگر لے بھی آئیں
تو کسی سہارے کے بغیر چالیس فٹ چوڑے اس خلا کو اس سے پاشنا
ویسے بھی ناممکن ہے۔ ہمارے پاس جو رتی ہے وہ بھی اتنی لمبی نہیں
کہ اس کے سہارے ہزار فٹ کی میندی سے اُتر جا سکے۔ غرض بالو سی
ہی بالو سی ہے۔

میں نے چلا کر کہا: ان لوگوں کو بس کل تک کے لیے روک لو
میں ان کے ذریعے خط بھیجوں گا۔
ٹھیک ہے۔ زبُونے کہا: لیکن میں آپ کے لیے کیا کروں؟
آخر ہماری ہدایت پر زبُونے دو تین تیلی لیکن مضبوط رسیاں لیں
اور انھیں آپس میں باندھ کر مخروطی پہاڑی پر آ کے آدھی رسی کا ایک
گولہ بنا کر ہماری طرف پھینک دیا۔ یہ رتی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ
ہم اس کا پل بنا سکتے لیکن اس میں باندھ باندھ کر زبُونے کا رتو سور
کی پٹیاں، کھانے پینے کا سامان اور دوسری چیزیں ہم تک پہنچا دیں
وہ ایک پٹی رتی میں باندھ دیتا اور اُسے مچھلا کر ہم کھینچ لیتے۔ پھر
آدھی رتی گولہ بنا کر اس تک پھینک دیتے۔ اسی میں شام ہو گئی۔
رات کو ہم اسی کنارے پر رہے۔ میں ایک چھوٹی سی موسم تھی جلا کر
یہ واقعات لکھتا رہا۔ پھر ہم نے کھانا کھایا۔ آگ اس ڈر سے نہیں
جلائی کہ نہ جانے اس کا نتیجہ کیا ہو۔

کل۔ بلکہ آج (کیونکہ صبح ہو رہی ہے) ہم اس سر زمین کا جائزہ
لیں گے۔ نہ جلنے میں اگلی قسط کب بھیج سگوں گا اور بھیج بھی سگوں گا
یا نہیں۔ زبُونے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ نیچے میدان میں آگ جل
رہی ہے اور اُس کے پاس دونوں مقامی باشندے موجود ہیں۔ صبح
زبُونے اس مخروطی پہاڑی پر آئے گا اور میں یہ کاغذ اُسے دے دوں گا
مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ ہماری واپسی کس طرح ہوگی۔ اگر اس

اُس کے دوسرے دن ہمارے لیے حیرت انگیز اور ایک سے ایک
 انکھے تجڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلا تجڑہ تو یہ ہوا کہ صبح ہوتے
 ہوتے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ ٹھہلی اور میری نظر اپنی ٹانگوں پر
 پڑی۔ پتلون اوپر کھسک گئی تھی اور جہاں موزہ ختم ہوتا تھا اس
 سے ذرا اوپر اُدے زنگ کا ایک بڑا سا گول کیرا بیٹھا ہوا تھا۔
 میں نے گھبرا کر اُسے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی سے نوچا تو وہ پچک
 گیا اور خون کے پھینٹے ادھر ادھر اُٹھے۔ بے اختیار میرے منہ
 سے چیخ نکل گئی جسے سن کر چلیخبر اور سمرلی دونوں میرے پاس آگئے۔
 مگر بجائے ہمدردی کرنے کے انھوں نے مجھے مبارک باد دی کہ اس
 نئی سرزمین پر سب سے پہلے مجھے کسی جاندار کا نشانہ بنا پڑا۔
 چلیخبر نے کہا: تمہارا نام سائینس کی تاریخ میں درج کیا جائے گا۔
 اُبھاڑ میں جائے تمہاری سائینس۔ میں نے جل کر کہا۔ اس پر چلیخبر
 نے کہا کہ میں سائینس کے بارے میں آئندہ کبھی تو ہین آمیز باتیں نہ
 کروں۔ اُس نے کہا۔

یہ کپڑے تو ایک رحمت ہیں۔

ایک رحمت ابھی ابھی تمہارے گریبان میں داخل ہوئی ہے۔

سمرلی نے کہا اور چلیخبر نے پاگلوں کی طرح اچھلنا اور گریبان نوچنا
 شروع کر دیا۔ جیکٹ اور قمیص اتاری گئی تو ایک رنگینے دالا بال دا
 لٹا، کلا، برآمد ہوا جو خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی ساڑھے چارٹ

حیرت، تعجب

حیرت — اچنبھا — تعجب — عجوبہ — غرض اس قسم کے
 جتنے الفاظ دنیا کی زبانوں میں ہیں۔ ان سب کو استعمال کرنے کے بعد
 بھی میں اپنے وہ محسوسات ظاہر نہیں کر سکتا جو اس عجیب و غریب
 دنیا کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوئے۔ میرے پاس صرف پانچ کاپیاں
 چند سادہ کاغذ اور صرف ایک پنسل ہے۔ جب تک یہ چیزیں ساتھ
 دیں گی میں لکھتا رہوں گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں اپنا
 مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے اور مرنے سے پہلے میں یہاں کے زیادہ
 سے زیادہ حالات لکھ دینا چاہتا ہوں۔ ابھی زہبونیچے میدان میں
 موجود ہے۔ وہ یہ کاغذ لے جائے گا یا اگر کوئی معجزہ ہو گیا اور ہم
 لوگ نیچے اتر کے تو ہم خود لے جائیں گے۔ یا پھر شاید کبھی کوئی
 بھولا بھٹکا ہمت والا تیاچ چھوٹا سا ہوائی جہاز لے کر ادھر آ گیا
 تو یہ معلومات اُس کے کام آئیں گی۔

ہاں تو جس دن اس کم سخت گوہر نے سطح مریخ پر ہمیں قید کیا تھا

لمبا تھا۔ چیلنجر کی بڑھلاہٹ پر ہم لوگ حیرت منہ سے یہ جگہ طرح طرح کے کیڑوں مکوڑوں سے بھری ہوئی تھی لہذا ہم نے یہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد زنبو پھر سامنے والی مخروطی پہاڑی پر آیا۔ وہ اپنے ساتھ کوکو کے ٹین اور بسکٹ لایا تھا۔ یہ سامان اُس نے پھینک کر ہم تک پہنچا دیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ اب تمہارے پاس جو سامان ہے اُس میں سے اپنے لیے دو مینے کا رکھ کر باقی ان دونوں آدمیوں کو دے دو اور انہیں واپس کر دو۔ یہ گویا میرا خط لے جانے کی اجازت تھی۔ زنبو نیچے اتر گیا اور کچھ دیر بعد ہم نے انہیں سامان کی گٹھڑیاں سر پر رکھے واپس جاتے دیکھا۔ اب بیچے ہمارے خیمے میں زنبو اکیلا رہ گیا اور اسی کے ذریعے باقی دنیا سے ہمارا تعلق قائم تھا۔ ہم وہاں سے ہٹ کر کچھ دور ایک ایسی جگہ چلے گئے جہاں اونچے اونچے درختوں کے بڑے سے گول حلقے کے درمیان ایک ہموار چٹان تھی اس سے اچھی جگہ ہمیں نہ مل سکتی تھی۔ چاروں طرف چڑیوں کے چھپانے کے سوا دوسری آواز نہ مٹائی نہ دیتی تھی۔ ان چڑیوں میں ایک رنگین چڑیا ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔

سب سے پہلے ہم نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ہم جو سامان اپنے ساتھ لائے تھے اور جو بعد میں زنبو نے پہنچایا۔ وہ بہت کافی تھا۔ اس سامان میں سب سے اہم چیز ہماری چاروں انگلیں اور ایک ہزار

تین سو گولیاں تھیں۔ ان کے علاوہ ایک نالی بندوق اور اس کے ڈیڑھ سو سے اوپر کارڈس بھی تھے۔ کھانے پینے کا سامان کئی ہفتے کے لیے کافی تھا۔ تمباکو بہت تھا۔ کچھ سائیکس آلات بھی تھے جن میں چھوٹی بڑی دو عدد پینیں بھی شامل تھیں۔

ہم نے سب سے پہلے سارا سامان قرینے سے جمایا اور پھر کانٹوں اور جھاڑیوں کاٹ کر انہیں تلے اوپر رکھ کر ایک دیوار سی بنالی جو پندرہ فٹ دائرے میں تھی۔ فی الحال یہی ہماری پناہ گاہ تھی۔ اس کا نام ہم نے فورٹ چیلنجر رکھ دیا۔ ایک درخت جو سب سے لمبا تھا اس کی گھنی شاخیں فورٹ چیلنجر پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔

چیلنجر نے سب کو ہدایت دی کہ بلا ضرورت کوئی اس قلعے کے باہر نہ نکلے۔ علاقے کا جائزہ لینے کے لیے سوچ سمجھ کر جایا جائے گا۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے ہم اس قلعے کے قریب رہیں۔ لارڈ جان نے یہ ہدایت دی کہ شدید ضرورت کے بغیر کوئی گولی نہ چلائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس دنیا کا نام کیا رکھا جائے؟ کئی تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخر میں پروفیسر کی اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا کہ چونکہ سب سے پہلے اس کا پتا میسل و ہائیٹ نے لگایا ہے اس لیے اسے میسل و ہائیٹ لینڈ کہا جائے۔

اب تک ہمارے تجربے کے مطابق یہ جگہ تقریباً غیر آباد تھی لیکن میسل و ہائیٹ کی خاکوں کی کتاب کے مطابق یہاں حیرت انگیز جانور

موجود تھے۔ پھر ہمیں بانسوں کے جھنڈ میں اُلجھا ہوا جو انسانی ڈھانچا بنا
بلا تھا اس سے بھی شبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کوئی آدمی بھی موجود ہے
گو باہارے لیے سخت خطرات تھے۔

علاقے کا جائزہ لینے کا شوق اتنا شدید تھا کہ ہم نے کانٹے دار
جھاڑیوں سے اپنے قلعے کا دوازہ بند کر دیا اور خود باہر نکل پڑے۔ مانے
ایک چشمہ تھا۔ ہم نے طے کیا کہ اس چشمے کے کنارے کنارے ہی
جائیں گے تاکہ واپسی میں راستہ بھولنے کا امکان نہ رہے۔

چشمے کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے جن میں طرح طرح کے درخت
تھے۔ پروفیسر جلیںجر ماہر نباتات بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان میں کئی درخت
ایسے ہیں جو ہزاروں برس پہلے دنیا میں ہوتے تھے لیکن اب ختم ہو چکے
ہیں۔ اچانک لارڈ جان کی آواز سنائی دی۔

”ارے یہ دیکھو۔ یہ کسی پرندے کے پیروں کے نشان ہیں مگر خدا کی
پناہ۔ کس قدر بڑے ہیں یہ نشان؟“

تین انگلیوں والے پنجوں کے یہ نشان جو کچھڑ میں بن گئے تھے۔
ان سے معلوم ہوتا تھا کہ پرندے نے دلدلی چشمہ پار کیا تھا اور جنگل
میں داخل ہوا تھا۔

”شتر مرغ کے پنجے کے مقابلے میں یہ پنجہ چوگنا بڑا ہوگا۔ اسی سے
اس کے قد کا اندازہ کر لو۔“ لارڈ جان نے کہا۔
مگر اس کے ساتھ چھوٹے نشان بھی ہیں۔“ سمرلی نے کہا۔ یہ نشان

ہلکے تھے اس لیے دیر میں نظر آئے۔

اچانک لارڈ جان نے ایک نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
”دیکھو۔ پانچ انگلیوں والا پنجہ ہے۔“

اُسے دیکھ کر جلیںجر نے حیرت سے کہا۔ ”ویلڈن میں جو کھدائی ہوئی ہے
اس کے دوران لیے نشان برآمد ہو چکے ہیں۔ یہ پرندہ نہیں ہے۔“
”پھر کیا ہے؟“ لارڈ جان نے پوچھا۔

”یہ ایک ایسا جانور ہے جو تین انگلیوں والے پنجوں کے بل سیدھا
چلتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اپنا پانچ انگلیوں والا پنجہ بھی زمین پر ٹکرا
دیتا ہے۔“

”کوئی سوچا یہ؟“

”جی نہیں۔ لیکن والا جانور۔“ ڈینو سار نے۔

یہ بات سن کر ہم سب سہم گئے۔ گویا وہ عظیم اور ہیبت ناک جانور
جو دنیا میں ہزاروں سال ہوئے ختم ہو چکا ہے، یہاں موجود تھا۔

ہم آگے بڑھے اور کچھ درختوں سے نکل کر جھاڑیوں میں آگئے۔
جھاڑیوں کے بعد ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس میدان میں پانچ
بجیب و غریب جانور کھڑے تھے۔ ہم جھاڑیوں میں پھپھے اطمینان سے
آنکھیں دیکھتے رہے۔ وہ مزے سے دھوپ سینک رہے تھے۔ ان میں دو
بڑے تھے اور تین چھوٹے۔ بچوں کا قد ہاتھی جتنا تھا اور بڑے تو اتنے بڑے
تھے کہ دنیا میں اتنے بڑے کسی جانور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان

کارنگ سلیٹی تھا اور جسم پر دھاریاں پڑی ہوئی تھیں جو دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اُن کی دم بہت موٹی اور لمبی تھی اور وہ پچھلے پیروں کے بل اُگڑوں بیٹھے ہوئے تھے پچھلے پیروں کے پنجوں میں تین تین انگلیاں تھیں اور اگلے پیروں یا ہاتھوں کے پنجوں میں پانچ پانچ۔ میں اُن کی شکل کے بارے میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ وہ کنگڑوں سے ملتے جلتے تھے مگر قد میں بیس فٹ سے اونچے تھے۔ اور اُن کی دم مگر ٹھیک سی تھی۔

خدا جانے ہم کتنی دیر کھڑے اُنھیں دیکھتے رہے۔ ہوا اُن کی طرف سے ہماری طرف چل رہی تھی اس لیے اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ ہماری بوسونگھ لیں۔ بچے آپس میں کھیل رہے تھے اور اچھل اچھل کر دھما دھما گورہے تھے۔ بڑے اپنے اگلے پنجوں سے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے۔ ایک جانور کے ہاتھ جب پتے نہیں آتے تو اُس نے اُس مضبوط درخت کو اس طرح گرا لیا جیسے وہ کوئی پودا ہو۔ اس سے جہاں اُس کی حیرت ناک طاقت کا اندازہ ہوا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جانور میں ذرا بھی عقل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ ذہنی درخت اُس کے سر پر آگرا تھا اور وہ تکلیف سے چیخ اٹھا تھا۔ ان کے بعد چاروں جانور چلے گئے۔

حیرت کے مارے بڑی دیر تک ہم چپ رہے۔ آخر سمرلی نے غارتگری اور کہا۔ انگلستان میں لوگ یہ واقعہ سن کر کیا کہیں گے؟

یہی کہ تم اول نمبر کے جھوٹے اور لپاٹے ہو۔ جس طرح تم نے میرے بارے میں کہا تھا۔ چلیجیجر نے سمرلی کو جواب دیا۔
 "اگر ہم اُنھیں نوٹو دکھائیں تب؟"
 "اُن تصویروں کو جعلی کہا جائے گا۔"
 "اور اگر ہم کوئی نمونہ لے جا کر اُنھیں دکھادیں؟"

"تب دوسری بات ہے۔ چلیجیجر نے کہا اور پھر ٹھہرے سے کہنے لگا۔ "ہاں بھئی میلوں، بلکہ لو اپنی ڈائری میں کہ 28 اگست کو ہم نے پانچ ایسے جانور دیکھے۔ اور چھو اور دو یہ خبر اپنے اُس چھٹیڑے اخبار میں۔"

یہ جانور جو ہم نے دیکھے تھے چونکہ سبزی خور تھے اس لیے ہم سے بے خطر تھے لیکن گوشت خور اور دندوں کا دبوذ بھی ممکن تھا اور یہی بات تھی جس سے ہم بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ مجھے پرانے زمانے کے جانوروں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن میں نے یہ ضرور پڑھا تھا کہ کسی زمانے میں دنیا میں ایسے جانور بھی پائے جاتے تھے جو شیر چیتوں کا اس طرح شکار کرتے تھے جیسے تلی چوہے کا شکار کرتی ہے۔

اب ہم بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ لارڈ جان ہم سے ذرا آگے تھے کیونکہ ان میں شکاری ہونے کی وجہ سے خطرے کی بوسونگھ لینے کی صلاحیت تھی۔ قدم قدم پر چلیجیجر اور سمرلی کو نئی نئی قسم کا کیرا یا بھنگا دیکھ کر ٹھہراتے اور پھر اس کی نسل اور خاندان کے بارے میں

بحث شروع کر دیتے۔

اب ہم ایک اور چھوٹے سے میدان میں نکل آئے جس میں ایک طرف بہت بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ میل و ہائیٹ لینڈ میں ایسے پتھروں کے ڈھیر ہیں جگہ جگہ ملے۔ پتھروں کے اس ڈھیر سے پہلے جھاڑیاں تھیں جو ہمارے سینے تک بلند تھیں۔ جھاڑیوں میں سے ہو کر جب ہم پتھروں کے پاس پہنچے تو اچانک بطخوں سے ہلتی جھکتی تیز آواز سنائی دی جس کے ساتھ بیٹیاں سی بھی بچ رہی تھیں۔ یہ آواز ہمارے بالکل قریب سے آ رہی تھی سلاڈ جان نے فوراً ہاتھ سے اشارہ کیا جس پر ہم خاموشی سے جھاڑیوں میں دب گئے۔ اس کے بعد وہ خود پنچوں کے بل آگے بڑھے اور پتھروں کی منڈیر کے اوپر سے کچھ دیکھنے لگے۔

جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ وہ ہمیں بھی بھول گئے۔ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ کئی منٹ بعد انھوں نے ہمیں آنے کا اشارہ کیا۔

ہم سب بھی بڑے اشتیاق مگر احتیاط سے پنچوں کے بل وہاں پہنچے۔ یہ ایک چوڑا اور گہرا غار تھا جس کی تمہ پیالے کی طرح تھی۔ غار اندر سے کئی سو متر تک گز گشاہ تھا۔ درمیان میں گدلا پانی تھا جس کا رنگ مینر تھا اور پانی کے چاروں طرف دیوڑا پرندے ٹیر وڈ گناہل بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ان کا گھونسل تھا۔ بہت سے بچے پانی کے ارد گرد

کھیل رہے تھے۔ کناروں پر کئی مادائیں بڑے بڑے پیلے رنگ کے بد شکل انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے گننے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ بہر حال بڑوں اور بچوں کی تعداد بلا کر ایک ہزار سے کم نہ ہوگی۔ ہم نے جو آوازیں سنی تھیں وہ اسی غار سے آ رہی تھیں۔ غار سے سخت بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔ اگر یہ منظر اتنا حیرت ناک نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی ایک لمحہ یہ بدبو برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتا۔

نر پرندے اپنی اپنی جگہ پر بالکل ساکت بیٹھے تھے، جیسے وہ پتھر کے بنے ہوں۔ البتہ ان کی سرخ سرخ خون ناک آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

چلینجیر اور سمرلی کو چونکہ پرانے زمانے کے جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے وہ دن بھر وہاں سے نہ ہٹے۔ غار میں مچھلیوں اور پرندوں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ پرندے گوشت خور ہیں۔ انگلستان میں کیمبرج کے پاس ایک جگہ ان پرندوں کی بہت سی ہڈیاں ملی تھیں۔ اب ثابت ہو گیا کہ وہ ایک ہی جگہ کیوں ملیں۔ دراصل یہ جانور ایک ہی جگہ نشین بنا کر رہنے کے عادی تھے۔ یہ مسئلہ صاف ہو جانے پر چلینجیر اور سمرلی دونوں نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

لیکن ان دونوں قابل آدمیوں کا یہ ملاپ زیادہ دیر باقی نہ رہا۔ جلد ہی دونوں میں اختلاف ہو گیا اور چلینجیر نے اپنی بات ثابت کرنے

کے لیے اپنا پورا سرنغا میں جھکا دیا۔ اداؤں کی یہی حرکت ہمارے لیے مصیبت بن گئی۔ چیلنجر کے سر کا سایہ دیکھتے ہی ایک زبردست نے چیخ ماری اور اپنے پس فٹ بے چرٹے کے پر پھیلا کر اُدپر اڑ گیا۔

خطرے کا یہ اشارہ پا کر مادائیں تو اپنے اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ گئیں اور ڈر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایک کر کے اڑنے لگے۔ دیکھنے میں یہ منظر بڑا اچھا تھا کہ سو کے لگ بھگ دیو زاد پرندے ہوا میں اُڑ رہے تھے اداؤں کے پردوں کی آواز ایسی تھی جیسے زور کی آندھی چل رہی ہو۔ لیکن پرندے غالباً اندازہ لگا رہے تھے کہ خطرہ کس حد تک ہے۔ اور جب انھوں نے ہم چاروں کو دیکھا تو ان کی پرداز کے دائرے چھوٹے ہوتے گئے اور وہ نیچے اڑنے لگے۔

”جلدی بھاگو۔ جنگل کی طرف۔۔۔ سب ساتھ ہی رہنا۔“

لارڈ جان نے ہدایت کی اور ہم سب دوڑ پڑے۔ لیکن اب وہ پرندے اتنے قریب آگئے تھے کہ ان کے پر ہمارے سروں کو چھوتے گزر جاتے۔ ہم اپنی بندوقوں کے کندے ان کے پردوں کو مارنے لگے مگر کوئی اثر نہ ہوا اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے لمبی لمبی گردنیں نکال کر ہمیں چونچیں مارنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے سمرلی زخمی ہوئے۔ ان کے چہرے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور دوسرے ہی لمحے میری پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ایسی زور کی ٹھونگ پڑی کہ میں لڑکھڑا گیا۔

اسی وقت چیلنجر گر پڑے اور میں انھیں اٹھانے جھکا تو میرے اس زور کی ٹھونگ لگی کہ میں بھی ان کے اوپر ہی گر پڑا۔

اچانک لارڈ جان کی ایک نالی بندوق چلنے کی آواز آئی اور ایک پرندہ جس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا زمین پر گر کر پھٹ پھٹانے لگا۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ اس لیے کہ اُس کے گرتے ہی باقی پرندے ڈر کر اُدپر چلے گئے اور وہیں چکر لگاتے رہے۔

”خدا کے لیے بھاگو۔“

لارڈ جان نے چیخ کر کہا اور ہم سب گرتے پڑتے جنگل میں گھس گئے۔ غنیمت تھا کہ گھنے درختوں کی دیبہ سے پرندے ہم تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ آخر کسی نہ کسی طرح ہم اپنے قلعے کی طرف آہی گئے۔ سمرلی کی پشانی اور میری پیٹھ میں گردن کے پاس زخم آئے تھے۔ لارڈ جان کا کوٹ کندھے پر سے پھٹ گیا تھا اور پرندے کی چونچ نے جلد پر ہلکا سا چرکا بھی لگا دیا تھا۔ لارڈ جان نے کہا:

”بھئی معاف کرنا۔ مجھے گولی چلائی پڑی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔“

اگر تم گولی نہ چلاتے تو شاید ہم زندہ بھی نہ بچتے۔ سمرلی نے جواب دیا۔

جب ہم فورٹ چیلنجر پہنچے تو دروازہ جیسا چھوڑ گئے تھے ویسا ہی بند تھا اور کانٹوں کی جھاڑیاں کانٹا کانٹا کر ہم نے جو دیواریں بنائی

تھیں انھیں بھی کسی نے نہیں چھوا تھا اس کے باوجود ہمارا سارا سامان تلوٹ تھا اور سب چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔
ہماری غیر موجودگی میں جو کوئی بھی آیا تھا اس کی طاقت کا بہ حال ہمیں اندازہ ہو گیا۔ اس لیے کہ گوشت کا ایک ٹین توڑ مروڑ کر پھینک دیا گیا تھا اور کارٹوسوں کی ایک پٹی کے تو پر خچے اڑا دیے گئے تھے۔

سمرلی اور چلیخبر تو ان دیوزاد پرندوں کی بناوٹ اور عادات وغیرہ کے بارے میں بحث میں مصروف ہو گئے۔ میں اور لارڈ جان الگ لیٹ کر بائپ پینے لگے۔ لارڈ جان نے کہا۔
"میلون، وہ غار آتش نشاں پہاڑ کا دہانہ تھا۔"
"ہاں۔"

اس کے اندر پانی کا جو گڑھا تھا اس کے کنارے مٹی کا رنگ کیا تھا۔

"شاید ہلکا نیلا تھا۔" میں نے جواب دیا۔
"آتش نشاں کے دہانے میں نیلی مٹی۔ آتش نشاں کے دہانے میں نیلی مٹی۔"

لارڈ جان بڑبڑاتے رہے اور مجھے نیندا آگئی۔
ان پرندوں کے کباب میں کوئی نہ ہر تھا۔ اس لیے کہ دوسرے دن میرے اور سمرلی کے زخموں میں شدید ٹیسس اٹھ رہی تھیں اور سنا۔

چلھا ہوا تھا۔ چلیخبر کے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی اور اب وہ سوچ گیا تھا۔ لہذا ہم اس روز باہر نہیں گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے سارا دن یہی احساس رہا کہ کوئی چھپ چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں نے چلیخبر سے ذکر کیا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ سنا میں ایسا ہی لگتا ہے۔

لیکن آپ یقین کیجیے کہ مجوں بچوں وقت گزرتا گیا میرا یہ احساس بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ جنگل کی روح کو رو پوری ہے جس سے امیزن کے لوگوں کا دم لگتا ہے۔

اور پھر رات کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہمیں اور بھی ڈرا دیا۔ وہ تو خدا لارڈ جان کا بھلا کرے کہ انھوں نے فورٹ چلیخبر کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام کیا تھا۔

ہم نے سونے سے پہلے اللہ جلا لیا تھا اور سو رہے تھے کہ اچانک عجیب و غریب چیخوں کی آواز سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ آگ بجھنے کے قریب تھی۔ یہ آوازیں ہمارے کیمپ سے صرف چند سو گز کے فاصلے سے آ رہی تھیں اور ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح تیز تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ چیخنے والا جانور بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ میرے تو ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے اور میرا خیال ہے کہ میرے ساتھیوں کی بھی یہی حالت تھی۔

اور پھر ان چیخوں کے ساتھ کسی اور جانور کے غرانے کی آواز

آئی۔ پہلے جانور نے ایک خوفناک چیخ ماری جو اچانک ختم ہو گئی۔ جیسے گلے میں گھٹٹ کر رہ گئی ہو اور پھر بائنگل خاموشی چھا گئی۔ ہم اس کے بعد بھی کئی منٹ گم سم بیٹھے رہے۔ بڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔
”یہ کیا تھا؟“

”صبح چل کر دیکھیں گے۔“ لارڈ جان نے جواب دیا۔ اس پر پیچھنے نے کہا: ”یہ سارا ہنگامہ یہ تھا کہ ایک جانور نے دوسرے کا شکار کیا ہے۔ جنگلوں میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے اور آج بھی ہوتا ہے۔“ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سمرلی نے ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کو کہا۔ ہم نے غور سے سنا تو کوئی جانور ہمارے قلعے کا چکر لگا رہا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت وزنی ہے اور اس کے پاؤں گدی دار ہیں۔ پورا چکر لگا کر وہ دھانزے کے پاس آکھڑا ہوا۔ اس کی تیز تیز سانوں کی آواز صاف سناٹی دے رہی تھی جیسے دھونکنی چل رہی ہو۔ اس کے اور ہمارے درمیان کانٹوں دار جھاڑیوں کی ایک دیوار تھی جسے وہ آسانی سے روند سکتا تھا۔

ہم نے بندھتیں سنبھال لیں اور جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اندھیرے میں جانور کا بڑا ہیولا نظر آیا۔ دو بڑی بڑی سبز رنگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اچانک جھاڑیوں میں کچھ آواز ہوئی جیسے وہ ایک پیر سے اٹھیں ٹٹول رہا ہو۔

”یہ شاید گود کراندر آئے گا۔“ میں نے کہا اور نشانہ لینے لگا مگر لارڈ جان نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا۔

”رات کے سناٹے میں گولی کی آواز بہت دور تک سناٹی دے گی۔“ اور اگر یہ گود کراندر آ گیا تو ہوسمرلی نے گھبرا کر کہا جس پر لارڈ جان نے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود الاڈ میں سے ایک سُلگتی ہوئی بڑی سی لکڑی اٹھالی۔ اس کے بعد اچانک دروازہ کھول کر اٹھوں نے جانور کے منہ پر وار کیا۔ اس کا منہ بند ک جیسا تھا اور کھال پر تیندوے کی طرح کے نشان تھے۔ سُلگتی ہوئی لکڑی منہ پر پڑتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ جھاڑیوں کے روندے جانے کی آواز دیر تک آتی رہی۔ لارڈ جان نے ہنستے ہوئے وہ لکڑی واپس الاڈ میں ڈال دی۔ ہم سب ان کی اس جرات پر عیش عیش کر اٹھے۔ واقعی وہ سچے شکاری تھے۔

ادھر پھر چلینگر اور سمرلی میں زوردار بحث شروع ہو گئی کہ یہ جانور حیوانوں کی کس نسل، کس خاندان اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا قریب تھا کہ یہ بات بڑھ جاتی کہ لارڈ جان نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کر دیا۔

”آئندہ سب ایک ساتھ نہیں سوئیں گے۔ باری باری ایک ایک آدمی دو دو گھنٹے پہرا دیا کرے گا۔“
”صبح کو ہم یہ دیکھنے کے لیے نکلے کہ رات لڑائی کہاں ہوئی تھی۔“

اُس کھلے میدان میں جہاں ہم نے ڈینوسار دیکھے تھے۔ بہت سارا خون پڑا ہوا تھا جس سے کیچڑ سی ہو گئی تھی۔ گوشت کے لوتھڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ شاید کئی جانور مارے گئے ہیں لیکن غور سے دیکھنے سے پتا چلا کہ کوئی بہت بڑا جانور تھا جس کو کسی اُس سے بھی زیادہ طاقت و رادہ خونخوار جانور نے چیر بھاپ کر رکھ دیا تھا۔

سمرلی اور چیلینجر میں پھر بحث چھڑ گئی کہ یہ کس قسم کے جانور ہو سکتے ہیں۔ گوشت کے لوتھڑوں، ہڈیوں، زخموں کے نشانات وغیرہ کی بنیاد پر وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور پرانے زمانے کے عجیب و غریب قسم کے جانوروں کے نام لے رہے تھے جن میں سے بہت سے نام میرے لیے بالکل نئے تھے۔ آخر لارڈ جان نے کہا۔

”شکاری جانور دوبارہ پیٹ بھرنے کے لیے شکار کی جگہ واپس آ رہے۔ اس لیے یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔“

یہ کہتے ہوئے لارڈ جان کی نظر گوشت کے ایک لوتھڑے پر پڑا جس کی کھال پر راکھ کے رنگ کا گول حلقہ سا بنا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا تھا۔ سمرلی نے کہا۔

”پرسوں ہم نے یہاں جو جانور دیکھے تھے، میرا خیال ہے اُن کی کھال پر بھی ایسے ہی نشان تھے۔“

چیلینجر نے کہا۔ یہاں جلے ہوئے پتھر کی چٹانیں ہوں گی جن سے یہ نشان لگ گیا ہوگا۔

یوں یہ بات ختم ہو گئی۔ ہم دیوار پر بندوں کے غار سے بچتے ہوئے کچھ دور تک گئے۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں اتنا جھاڑ جھنکار تھا کہ قدم اٹھانا مشکل تھا۔ ان جھاڑیوں میں عجیب و غریب قسم کے پھول بھی کھلے تھے۔ چیلینجر اور سمرلی نے بتایا کہ یہ نباتات کی ابتدائی شکل ہے۔ دنیا میں اس قسم کے پودے ختم ہو چکے ہیں۔

درختوں میں طرح طرح کے پھل بھی لگے ہوئے تھے۔ کچھ تو جانے پہچانے تھے لیکن باقی نئے تھے۔ بعض تو اتنے خوب صورت تھے کہ بے اختیار کھالینے کو جی چاہتا تھا لیکن اس ڈر سے جی مار کر رہ گئے کہ کہیں زہریلے نہ ہوں۔ بعد میں کچھ پھل چڑیوں کو کھاتے دیکھ کر ہم نے بھی کھائے۔ اُن کا مزہ میں زندگی پھر نہ بھول سکوں گا۔

دانتے میں طرح طرح کے جانوروں کے پیروں کے نشان بے جن پر بکشت ہوتی رہی۔ لارڈ جان نے، جن کے پاس دُور بین تھی، بتایا تھا کہ دُور درختوں کے ایک جھنڈ تلے، بہت سے ڈینوسار آرام کر رہے ہیں۔ ہم نے باری باری دیکھا۔ ان کے جسموں پر بھی راکھ کے رنگ کے گول نشان تھے لیکن وہ جسم کے دُوسرے حصے پر تھے۔ کافی غور کرنے کے بعد بھی ہم اس کی وجہ معلوم نہ کر سکے۔

پھر ہم نے بہت سے چھوٹے جانور بھی دیکھے۔ مثلاً سیبہ، مورخوڑا

چھوٹی نسل کے جنگلی سور وغیرہ، درختوں کی آڑ میں ہم نے تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک جانور کی جھلک بھی دیکھی۔ لارڈ جان کے خیال میں وہ ہرن کی قسم کا کوئی جانور تھا لیکن اس کا قد ہمارے ہاں کے ہرنوں سے دوگنا بڑا تھا۔

جب سے ہمارے قلعے پر چھاپا مارا گیا تھا، ہم بہت ڈر گئے تھے لیکن وہاں واپس پہنچے پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ملا۔ کھانا کھا کر اور کچھ آرام کرنے کے بعد ہم نے غور کرنا شروع کیا کہ پورے علاقے کا جائزہ کس طرح لیا جائے۔

لارڈ جان کچھ سوچ رہے تھے۔ کہنے لگے: تم لوگ اس علاقے میں اور اندر گھسنے کی فکر کر رہے ہو۔ یہ بھی تو سوچو کہ یہاں سے باہر نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟

اس پر چلینجر نے سنجیدگی سے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سائنسی چھان بین کا شوق رکھنے والا کوئی آدمی ایسی گھٹیا بات کیوں کر کہہ سکتا ہے۔ تمہارے خیال میں ہم تحقیق کے اس لاجواب موقع سے فائدہ اٹھائے بغیر واپس چلے جائیں؟

سمرلی شاید لارڈ جان کے حامی تھے۔ کہنے لگے: میں لندن میں جن طالب علموں کو پڑھاتا ہوں۔ ان کا بڑا حرج ہو رہا ہوگا۔ مگر چلینجر پر تو کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے، اس لیے انھیں چھان بین کی سوجھ رہی ہے۔

اعلیٰ ذہن رکھنے والے لوگ پڑھانے جیسا گھٹیا کام نہیں کرتے۔ چلینجر نے جواب دیا۔

”سچ پوچھیے تو اس علاقے کی پوری سیر کیے بغیر خود میرا دل بھی واپس ہونے کو نہ چاہتا تھا۔ اخبار میں ادھوری رپورٹ شائع کرنے کا کیا فائدہ؟ پھر میں تو یہ کارنامہ گلیڈی کے لیے انجام دے رہا تھا۔ اس لیے اے ادھورا نہ چھوڑ سکتا تھا۔ ادھر سمرلی اس پر اڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا۔

اس جماعت کو مگر چلینجر کے دعوے کی تصدیق کا کام سونپا گیا تھا اب تک ہم نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی بنا پر ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ لہذا اب یہاں ٹھہرنے سے کیا ماصل۔ یہاں یہ خطرہ بھی ہے کہ ہم کسی دلدے کا شکار بن جائیں۔ اور جو معلومات سائنس کے لیے لے جاسکتے ہیں ان سے بھی رہ جائیں؟

لارڈ جان نے سمرلی کی بات کی پُر زور تائید کرنے کے بعد کہا اس سطح مرتفع تک پہنچنے کے لیے ہم پر و فیسر چلینجر کی ذہانت کے شکر گزار ہیں۔ اُمید ہے کہ اب وہ یہاں سے نکلنے کی ترکیب سوچ کر مزید شکر یے کا موقع دیں گے۔

چلینجر نے کہا: یقیناً ہمیں واپسی کے سوال پر غور کرنا ہے اور اس سلسلے میں میرا اعلیٰ ذہن دوستوں کی خدمت کے لیے حاضر ہے لیکن جب تک کوئی راہ نکلے، اس علاقے کو ایک نظر دیکھ لینے میں

کیا مصالحو ہے؟

بات ٹھیک ہی تھی۔ اس سے کون انکار کر سکتا تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ میں اس علاقے کا جغرافیہ معلوم نہیں تھا۔ گھنے جنگلوں اور جھاڑ جھنکار سے بچتے ہوئے علاقے کا دورہ کس طرح کیا جاتا۔ آخر میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ ہمارے قلعے میں ایک بہت اونچا اور گھنا درخت تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس پر چڑھ کر دور بین سے اردگرد کا جائزہ لیا جائے۔

یہاں میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ بچپن میں درختوں پر چڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرے ساتھی پہاڑوں پر چڑھنے کا بھلے ہی مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتے ہوں لیکن پیڑ پر چڑھنے میں وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

میری تجویز سن کر سب خوش ہوئے۔ لارڈ جان نے میری پلیٹھ تھپکی اور کہا: ابھی سورج ڈوبنے میں ایک گھنٹا ہے۔ کاپی اور پنسل لے کر اوپر چڑھ جاؤ اور علاقے کا نقشہ بنا ڈالو۔ شاباش میرے شیر۔ ذرا جلدی۔"

درخت کا اونچلا تنا اگر ذرا پتلا ہوتا تو میں آسانی سے اس سیدھے درخت پر بھی چڑھ جاتا۔ لیکن وہ اتنا موٹا تھا کہ میری گرفت میں نہیں آتا تھا۔ آخر ہم نے کارڈسوں کی پٹیاں درخت کے نیچے ایک دوسرے پر جمائیں۔ ان پر چیلنجر چڑھ گئے۔ میں نیچے کھڑا رہا۔ اچانک

چیلنجر نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے میرے بازو پکڑ کر اٹھایا اور ایک ہی جھونک میں اتنے زور سے اچھالا کہ میں درخت کے پہلے گدے تک پہنچ گیا۔ جلدی سے میں نے دونوں ہاتھوں سے گدا مقام لیا اور بدن جھلا کر اوپر پہنچ گیا۔ اس سے آگے تو شاخیں ہی شاخیں تھیں۔

میں بڑی تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ موٹی موٹی بلیں درخت سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان سے بھی بڑا سہارا مل رہا تھا۔ نیچے سے چیلنجر کی آواز اب بہت مدھم سٹائی دے رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنے پتوں کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اوپر دیکھا تو درخت ابھی بہت اونچا تھا۔ میں پھر چڑھنے لگا اور پھر ایک بار جب میں نے گھنے پتوں والی ایک پتلی شاخ اپنے سامنے سے ہٹائی تو بس یہ سمجھے کہ مارے ڈر کے گرتے گرتے بچا۔ مجھے صرف دو فٹ کے فاصلے پر ایک چہرہ دکھائی دیا تھا۔ یہ ایک انسانی چہرہ تھا۔ کسی بندر کا چہرہ انسان سے اتنا ملتا جلتا نہیں ہو سکتا تھا۔ سفید رنگ کے لمبوترے چہرے پر کثرت سے ہاسے تھے۔ ناک چپٹی تھی اور جبراً اذیا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر بے ترتیب سی ڈاڑھی بھی تھی۔ گھنی بھوڑوں کے نیچے دو ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑبڑایا، دانت پیسے اور پھر نیک ایک ایک بیل پکڑ کر گود گیا۔ میں نے اس کے جسم کی ایک جھلک دیکھی۔

لال لال جسم تھا اور بالکل ننگا۔
اس کے بھاگنے سے کئی شاغیں ٹوٹیں جن کی آواز نیچے بھی گئی
ہو گی۔ اس لیے لارڈ جان نے نیچے سے چلا کر پوچھا کیا ہوا، خیریت
تو ہے؟

”آپ نے اُسے دیکھا؟ میں نے چیخ کر کہا۔ ابھی تک میرے جسم
میں تھر تھری تھی اور دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔

”ہیں ایسا لگا جیسے تمہارا پیر پھسل گیا ہو۔ لارڈ جان کی آواز آئی
میرا توجہ چاہتا تھا کہ فوراً نیچے اتر آؤں اور اپنے ساتھیوں کو
بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔ لیکن پھر سوچا کہ جس کام کے لیے چڑھا
ہوں اُسے بھی کرتا ہی چلوں۔ میں نے اپنے اوسان ٹھیک کیے۔
اور پھر اوپر چڑھنے لگا۔ جلد ہی سب سے اونچی ٹہنی پر پہنچ گیا جو
میرے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ یہاں بڑی تیز ہوا تھی جس سے
اندازہ ہوا کہ یہ پٹر آس پاس کے تمام درختوں سے اونچا ہے۔ میں
نے اپنے سامنے کی تہی تہی شاغیں توڑ ڈالیں جن کے پتوں نے مجھے
ڈھک رکھا تھا۔ اس کے بعد سامنے نظر ڈالی۔ اب پورا علاقہ مجھے
نظر آ رہا تھا۔ یہ بیضوی شکل کا تھا۔ سامنے کوئی تیس میل اور دائیں
سے بائیں بیس میل لمبا چوڑا۔ کنارے اونچے تھے اور درمیان میں
تشیب ہوتا چلا گیا تھا۔ یہ بچوں بچ جھیل تھی جس کا رقبہ دس مربع میل
سے کم نہ ہوگا۔ جھیل کے چاروں طرف سبز ہی سبز تھا اور ایک طرف

نزل آگے ہوئے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں کناروں کی
ریت سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ ریت میں کالی کالی، لمبی لمبی
کچھ چیزیں سی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مگر مچھوں سے بڑی اور کشتیوں سے
چھوٹی تھیں۔ دُور بین سے دیکھنے سے پتا چلا کہ یہ جانور ہیں مگر یہ نہ
معلوم ہو سکا کہ یہ کس قسم کے جانور ہیں۔

ہمارے نکلنے سے یہ جھیل کوئی چھ میل دُور تھی۔ ڈینوسار جہاں
دیکھے گئے تھے وہ جگہ اور دیونا د پندوں کا غار اس سے پہلے تھا۔
جھیل سے آگے کا علاقہ بالکل دوسری قسم کا تھا۔ آخری کنارے
میں راکھ کے رنگ کے جلے ہوئے پتھروں کی کوئی سو فٹ بلندی
دیارنا چٹانیں تھیں۔ ان سے اندر کی طرف ڈھال تھا۔ دُور بین
سے دیکھنے پر ان چٹانوں میں کالے کالے سوراخ سے نظر آئے جو
میرے خیال میں غاروں کے منہ تھے۔ ایک غار کے آگے کوئی سفید
سفید سی چیز حرکت کر رہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کیا چیز
تھی۔

جو کچھ مجھے نظر آیا، میں اس کا نقشہ بناتا گیا تھا تاکہ اتنا
اندھیرا ہو گیا کہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ میں اترنے لگا۔ جی
چاہتا تھا کہ ایک ہی جگہ میں نیچے پہنچ جاؤں۔ جب نیچے اترتا
تو سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں نے نقشہ دینے سے پہلے انہیں
بتایا کہ درخت پر مجھے ایک بن مانس ملا تھا۔

میں نہ کتا تھا کہ ہمیں کوئی چھپ چھپ کر دیکھا کرتا ہے۔ وہ
یہی بن مانس تھا۔ میں نے کہا۔ اس پر چلینجر اور سمرلی نے مجھ پر
سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔
”کیا اس کے دم ہفتی؟“

”نہیں۔“

”پیروں کی چار انگلیاں ایک طرف اور انگوٹھا دوسری طرف تھا یا
سب ساتھ ہی ساتھ تھے؟“
”یہ میں نہیں دیکھ سکا۔“

چلینجر نے کہنا شروع کیا۔ جنوبی امریکہ میں بندروں کی چھتیس نہیں
پائی جاتی ہیں لیکن بے دم کا بندر یہاں نہیں ہوتا۔ البتہ اس سطح تفرق
پر وہ بھی موجود ہے اور جو تفصیل تم نے بتائی اس سے پتا چلتا ہے
کہ وہ انسان سے بہت قریب ہے۔ یعنی بندر کے انسان بننے کے سلسلے
کی آخری کڑی۔“

پھر پروفیسر چلینجر کچھ سوچ کر بولے۔ گورے رنگ کا بن مانس آج
تک نہیں دیکھا گیا۔ سائنس دان جسے گم شدہ کڑی کہتے ہیں اس کا
اصلیت ہمیں معلوم کرنا ہی پڑے گی۔
”ہوش کی دوا کر دو۔ سمرلی نے جل کر کہا۔ یہ بے چارہ اوپر جا کر
نقشہ بنا لایا ہے اسے دیکھو اور واپسی کی سوچو۔“
”یہ تہذیب کا گوارا ہے۔“ چلینجر نے بڑی سنجیدگی سے کہا جس پر

سمرلی نے جواب دیا۔

بھاڑ میں گئی تمہاری تہذیب اور اس کا گوارا۔ جو کچھ معلوم ہو
چکا ہے اسے لکھ ڈالو اور باقی تحقیقات دوسروں کے لیے چھوڑ
دو۔“

چلینجر بولے۔ مجھے اس سے تو اتفاق ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے
اسے جلد سے جلد تہذیب دنیا تک پہنچ جانا چاہیے۔ لیکن یہاں سے
نکلنے کے بابے میں ابھی میں کوئی طریقہ نہیں سوچ سکا ہوں۔ بہر حال اطمینان
رکھو کہ آج تک میں نے ایسا کوئی مسئلہ نہیں دیکھا جسے سلجھانے میں میرا
اعلیٰ ذہن ناکام رہا ہو۔ کل میں اس مسئلے پر ضرور توجہ دوں گا۔
بات طے ہو گئی۔ اس رات موم بتی کی روشنی میں میں نے
میدیل دہائیٹ لینڈ کا پہلا نقشہ بنایا جو کچھ اس طرح کا تھا۔



چلیں نے نقشے کو غور سے دیکھ کر جھیل پر اپنی پنسل گھماتے ہوئے کہا: اس جھیل کا کیا نام رکھا جائے؟
 "تمہارے نام پر رکھ دیں؟" سمرلی نے طنز کیا جس کی کاٹ چلیں نے
 اس طرح کی۔ "وہ بڑے ہی غیر اہم لوگ ہوتے ہیں جو کسی پہاڑ، دریا یا
 جھیل کا نام اپنے نام پر رکھتے ہیں۔ میرے پاس شہرت کے دوسرے
 ذریعے موجود ہیں۔"

آخر ان لوگوں نے طے کیا کہ چونکہ میلون نے اسے سب سے پہلے
 دیکھا ہے اس لیے اسے جھیل میلون کہا جائے۔ یہ سن کر میں نے تجویز
 پیش کی کہ اسے میرے نام سے منسوب کرنے کے بجائے جھیل گلیڈی
 کیے۔

اور اس جھیل کا نام جھیل گلیڈی طے ہو گیا۔

کیمپ پر حملہ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں اپنے ساتھیوں میں سب سے
 کم عمر اور نا تجربہ کار تھا۔ مگر جب میں نے ایک ادھ ایسا کار نامہ انجام
 دیا جس پر میرے ساتھیوں نے مجھے مبارک باد دی تو پھر مجھے بھی دور
 کی سوجھنے لگی اور مزید کارنامے انجام دینے کے شوق میں اگلی رات کو
 میں مرتے مرتے بچا۔

ہوا یہ کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پورا دینے کی باری سمرلی کی تھی۔
 وہ الاڈ کے پاس گھٹنوں پر بندوق رکھے بیٹھے اُدنگھ رہے تھے۔
 لارڈ جان سورہے تھے اور چلیں کے خواتے جنگل میں گونجتے محسوس
 ہو رہے تھے۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہوا میں مٹھکی تھی۔ میں لیٹا
 ہوا چاند کو تک رہا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ چپکے سے جھیل
 تک ہو آؤں۔ صبح کو اپنے ساتھیوں کو اس کے بارے میں بتاؤں گا
 کہ انہیں بہت حیرانی ہوگی۔

یہ سوچ کر میں چپکے سے اٹھا۔ رائفل سنبھالی، دونوں جیبوں میں

کارٹوس بھرے اور باہر نکل آیا۔

میں آگے نہیں بڑھتا چلا گیا۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ چاند نظر نہ آتا تھا۔ اندھیرے میں جگہ جگہ سیاہ دھبے نظر آتے تو میں سمجھتا تھا کہ یہ کسی جانور کا بھٹ ہوگا۔ میں آہٹ کیے بغیر اس کے سامنے سے گزر جاتا۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ احتیاطاً رائفل بھر لینا چاہیے یہ سوچ کر میں نے ایک کارٹوس نکالا اور رائفل میں بھرنے لگا۔ تب پتا چلا کہ میں غلطی سے لارڈ جان کی ایک نالی بندوق اٹھا لیا ہوں اور میرے پاس کارٹوس رائفل کے ہیں۔

اب بھی میں رٹ جاتا تو خیریت ہوتی مگر وہاں تو کوئی کارناہ انجام دینے کا بھوت سر پر سوار تھا لہذا میں بڑھتا ہی رہا اور ڈیڑھ گھنٹے کا میدان ڈرتے ڈرتے پار کر لیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی جانور نہ تھا۔ میں درخت پر سے دیکھ ہی چکا تھا کہ چشمہ بل کھاتا ہوا جھیل تک پہنچتا ہے لہذا میں چشمے کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ جانور چشمے پر پانی پینے آتے ہوں گے۔

کچھ دور اور آگے چل کر جنگل ختم ہو گیا۔ اکاڈ کا پیڑ اور جھاڑیاں رہ گئیں۔ میں دبے پاؤں ٹیروڈ کٹائلوں کے غار کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک دیو زاد پرندہ شاید میری آہٹ پا کر اڑا اور بیس فٹ چوڑے پر پھلائے آسمان کی طرف چلا گیا۔ جب وہ چاند کے سامنے سے گزرا تو اس کے پردوں میں سے روشنی چھٹی

سرو دکھائی دینے لگی اور وہ بالکل ایک ڈھانچا معلوم ہونے لگا۔ آگے بڑھنے پر مجھے ایک خاص قسم کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے رک کر اسے غور سے سنا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ آواز صاف ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہت بڑی کیتلی میں پانی ابل رہا ہو۔ آخر کار میں اس جگہ پہنچ گیا۔ یہ گرم پانی کا ایک چشمہ تھا جس میں سے گیس کے بلبلے بھوٹ رہے تھے۔ چشمہ چھوٹا سا تھا مگر اس میں سے بجاپ اٹھ رہی تھی اور اس پاس کی زمین اتنی گرم تھی کہ میں وہاں بٹھرنہ سکا۔

اب جنگل پھر شروع ہو گیا مگر وہ اتنا گھنا نہ تھا۔ کبھی کبھی ددر سے کسی جانور کے بھاگنے اور شاخوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی تو میں بہم جاتا مگر اب میں اتنا آگے بڑھا آیا تھا کہ لوٹ کر جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ آخر کوئی ایک بجے میں نے درختوں کے اس پار جھیل کے پانی کی جھلک دیکھی جو چاندنی میں چمک رہا تھا اور صرف دس منٹ بعد میں اس کے کنارے زرگلوں کے جھنڈ میں کھڑا تھا۔

کچھ چلنے کی وجہ سے اور کچھ خوف سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے جھیل میں لے کر پانی پیا۔ بڑا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا۔ قریب ہی ایک صاف سی جگہ تھی جدھر سے کچھ پگڈنڈیاں سی آ کر مل رہی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جانور یہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔

پیشہ پانی سے ابھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ ایک بار میں نے سنس
کی قسم کا ایک بڑا سا پرندہ دیکھا جس کی گردن بہت لمبی تھی۔
تھوڑی دیر بعد اُس نے غوطہ لگایا اور پھر نظر نہ آیا۔

میں نے چٹان کے نیچے نظر ڈالی تو کئی جانور نظر آئے جو پانی
پینے آئے تھے۔ وہ جانور ایسے تھے جن کے بدن پر سخت ہڈیوں کے
پھلے کے سے سفنے تھے۔ ایک بہت بڑا بارہ سینگا تھا جس کے ساتھ
اس کی مادہ اور دو بچے تھے۔ وہ بڑی شان سے آیا اور پانی پی کر
واپس چلا گیا۔

اچانک کچھ آہٹ ہوئی اور باقی سارے جانور ڈر کر بھاگ گئے۔
اور اب جو جانور آیا وہ نہایت عجیب و غریب تھا۔ اس کی پیٹھ کمان
کی طرح تھی جس میں ٹکونی تھکلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اونٹ کی سی
لمبی گردن، چڑیا کی شکل کا سر اور مگر جھج جیسی موٹی سی دم۔ میں
سوچنے لگا کہ یہ جانور جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے۔ آخر دماغ
بزدور دینے سے یاد آیا کہ پرندیسر چلنیجر کے ہاں میپل و ہائیڈ کی
ٹاکوں کی کتاب میں اسی جانور کا خاکہ دیکھا تھا۔

جانور اتنا وزنی تھا کہ اس کے قدموں کے دھماکوں سے زمین
لرز جاتی تھی اور جب وہ پانی پینے لگا تو پانی پینے کی آواز بڑی دُور
سے گونجتی محسوس ہوئی۔ کوئی پانچ منٹ تک وہ پانی پیتا رہا۔ اُس
وقت میں اگر جا ہتا تو ذرا سا جھک کر اُس کی پیٹھ کو چھو سکتا تھا۔

پانی کے قریب ہی سیاہ پتھر کی ایک چٹان تھی۔ میں اس پر چڑھ کر
کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ درخت
سے میں نے دیکھا تھا کہ علاقے کے آخری کنارے پر ساکھ کے رنگ
کی جو اونچی چٹانوں کی دیوار تھی اُس میں بہت سے کالے کالے دھبے
نظر آ رہے تھے، جیسے غار ہوں۔ لیکن اب اس طرف دیکھ کر
بڑی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ اب وہ سیاہ دھبے روشنی کے دھبوں
میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بڑے
جہاز کی کھڑکیوں سے روشنی آ رہی ہو۔

ظاہر ہے غاروں میں اس روشنی کا مطلب تھا آگ۔ اور آگ
کا مطلب تھا آدمی۔ گویا یہاں انسان بھی بستے ہیں۔ آف میرے
خدا۔ یہ کتنی عظیم دریافت تھی اور اس کا سہرا میرے سر تھا۔ ان
غاروں کا فاصلہ مجھ سے کوئی دس میل ہو گا۔ اس کے باوجود جھیل
روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

جھیل گلیڈی یوں لگ رہی تھی جیسے چاندی کی بڑی سی چادر
بچھی ہو۔ یہ غالباً زیادہ گہری نہیں تھی اس لیے کہ اس میں جاگ جاگ
چھوٹے چھوٹے ریتلے ٹاپو ابھرے ہوئے تھے۔ پانی میں کافی لہلہ
تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مچھلیاں وغیرہ بہت ہیں۔ کبھی کبھی
چاندی کے رنگ کی کوئی مچھلی اچھلتی اور ہلکے سے چھپا کے
ساتھ پھر پانی میں گر پڑتی۔ کبھی کبھی کسی بہت بڑے آبی جانور

اس کے بعد وہ اسی طرح قدموں سے زمین دہلاتا چلا گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بج چکے تھے۔ ایک رات میں میں نے جو کچھ دیکھ لیا تھا وہ آج تک دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔

میں خوش خوش کیمپ کی طرف چل دیا۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ میری ایک ایک بات پر چلیخرا اچھل اچھل پڑے گا۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہوا ہوگا کہ اچانک میں نے اپنے پیچھے کچھ عجیب قسم کی آواز سنی۔ یہ فرآنے سے ملتی جلتی بڑی ڈراؤنی آواز تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ بہر حال میں نے قدم تیز کر دیے اور تقریباً دوڑنے لگا۔

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی۔ مگر اب یہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ صاف اور زور کی تھی۔ یہ سوچتے ہی میرا خون خشک ہو گیا کہ کوئی جانور میرے پیچھے لگ گیا ہے۔ میرے روتنگے کھڑے ہو گئے اور گھٹنے کانپنے لگے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اس مرتبہ بھی کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک وہی آواز پھر آئی اور اب کے اور زیادہ قریب سے آئی۔ اب تو کوئی شبہ ہی نہیں تھا کہ کوئی جانور میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میرا سارا جسم سن سا ہو گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ایک خوفناک جانور دیکھا جو کھچلی ٹانگوں کے بل اچھلتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد ہاتھی سے بڑا تھا۔ پہلے تو

میں سمجھا کہ یہ وہی سنری خور اور بے ضرر ڈینوسار ہوگا لیکن جب اس کے سر پر میری نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ اس کی صورت بہن مٹی نہیں بلکہ مینڈک کی طرح ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہاتھی کے قد کا ایک خوفناک مینڈک اچھلتا چلا آ رہا تھا۔ یہ ویسا ہی جانور تھا جو ہمارے کیمپ کے پاس آیا تھا اور لارڈ جان نے اس کے منہ پر سگتی ہوئی لکڑی مار کر اسے بھگایا تھا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی گوشت خور ڈینوسار ہے۔ تھوڑی تھوڑی دور پھدکنے کے بعد وہ اپنا سر زمین کے قریب لاکر زو سے سونگھتا اور پھر بچھدکنے لگتا۔ ظاہر میری بو کا پیچھا کر رہا تھا۔ مجھے اب افسوس ہوا کہ میں غلط بندوق کیوں لے آیا۔ وہاں کوئی بڑا درخت بھی نہ تھا جس پر میں چڑھ جاتا۔ ویسے بھی وہ اپنی ایک ہی ٹنکر سے درخت کو گرا سکتا تھا۔ اب بھگنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں نے حواس درست کیے اور بھاگ نکلا۔ مگر اُدنی نیچی زمین اور بھاڑیوں کی وجہ سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہاں سے کیمپ کوئی آدھ میل تھا۔ میں نے بندوق پھینک دی اور اپنی زندگی کی لپٹ سے تیز دوڑ شروع کر دی۔ پنڈلیوں میں ٹہیس اٹھنے لگیں۔ سینے میں درد ہونے لگا۔ پیٹ میں سانس سمانی مشکل ہو گئی مگر اب بھاگتا ہی رہا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ میں ایک گڑھے میں گر پڑا ہوں۔ میں جلدی سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پیر گردن وغیرہ ہلا کر دیکھنے لگا۔ ٹھکرے کہ سب سلامت تھے۔ البتہ سارے جسم میں سخت درد تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ کس طرح ایک دیو میرا چھپا کر رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اوپر دیکھا کہ شاید وہ کم سخت اب تک وہاں موجود ہو لیکن کچھ نظر نہ آیا اور نہ کسی قسم کی آواز ہی سنائی دی۔

میں نے ادھر ادھر پھر کر جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ غار تقریباً بیس فٹ کے دائرے میں ہے۔ دیواریں بہت ڈھلوان اور چکنی تھیں۔ نیچے ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں اور گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے۔ کچھ ٹھکرے سڑ چکے تھے اور ان سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔ گڑھے کے درمیان میں ایک بلی گڑھی ہوئی تھی۔ میں نے پنوں کے بل کھڑے ہو کر ہاتھ بڑھایا تب بھی وہ اُس کے اوپر کے سرے تک نہ پہنچ سکا۔ بلی بڑی چکنی تھی میں نے سونگھ کر دیکھا تو پتا چلا کہ اس پر چربی ملی گئی ہے۔

راتنے میں مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں ایک مومی ماچس پڑی ہے۔ جلدی سے اُسے نکال کر ایک تیلی جلائی اور فوراً اس نیچے پر پھینچ گیا کہ یہ گڑھا انسانوں نے شکار کے لیے کھودا ہے۔ وہ اس کے اوپر گھاس پھوس رکھ کر اُسے چھپا دیتے ہوں گے۔ جانور کا پیر پڑتا ہوگا تو وہ اس میں گر پڑتا ہوگا۔ یہ بلی اوپر سے

کچھ دور بھاگنے کے بعد محسوس ہوا کہ شاید میں اسے پیچھے چھوڑ آیا ہوں لیکن اچانک بڑے زور سے دھپ کی آواز آئی۔ وہ کم سخت اب سر پر ہی آ پھینچا تھا۔ اب تو اُس کی سانس کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔ پہلے تو وہ صرف میری بو کا پیچھا کر رہا تھا اس لیے اُس کی رفتار تیز نہیں تھی لیکن اب تو اُس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔

میں نے رفتار اور تیز کر دی لیکن اُس کی دھپ دھپ کی آواز قریب ہی آتی گئی۔ ہر لمحے مجھے یہ محسوس ہوتا کہ اب اس کا پنجہ مجھ پر پڑا۔ میرے بھاگنے کی طاقت جواب دے چکی تھی اور قریب تھا کہ انتہائی بائرسی کے عالم میں میں اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دوں کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے اور میں نیچے گر رہا ہوں۔ نیچے گرتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔

لیکن چند ہی منٹ بعد مجھے ہوش آ گیا اور ایک تیز اور شدید بدبو کا احساس ہوا جو ناک کے نتھننے پھیرتی اندر گھسی جا رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اندھیرے میں ٹٹو لٹا شروع کیا تو جو چیز سب سے پہلے ہاتھ لگی وہ گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی سی ہڈی آ گئی۔ میں نے اوپر نظر ڈالی تو گولائی میں آسمان نظر آ رہا تھا جس میں تارے چمک رہے تھے۔

تیز نوکیلی ہوگی۔ جانور اس میں چھد کر ہلاک ہو جاتا ہوگا۔
 چلیخچر کا خیال تھا کہ یہاں انسان کی موجودگی ممکن نہیں کیونکہ
 جنگلی آدمی جس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار نہ ہوں اتنے
 بڑے بڑے درندوں کے درمیان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن مجھے
 اب ایسے ثبوت مل چکے تھے جن سے چلیخچر کا خیال غلط ثابت
 ہوتا تھا۔ ایک غاروں میں نظر آنے والی روشنی اور دوسرا شکل
 کا یہ گڑھا۔

ان ڈھلوان دیواروں پر سے چڑھ کر میں اُدپر آ سکتا تھا مگر یہ
 ڈر تھا کہ جو جانور میرا پیچھا کر رہا تھا وہ کہیں تاک میں نہ بیٹھا ہو
 میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے سمرلی اور چلیخچر کی وہ گفتگو یاد آگئی۔
 جو وہ ان جانوروں کے بارے میں کر رہے تھے۔ اُنھوں نے
 بتایا تھا کہ یہ جانور جتنے بڑے ہوتے ہیں ان میں عقل اتنی ہی
 کم ہوتی ہے۔ اسی لیے تو وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے
 آپ کو ڈھال نہ سکے اور دنیا میں ختم ہو گئے۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جانور واپس چلا گیا ہوگا۔ چنانچہ
 میں اُدپر آ گیا۔ تاروں کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی صبح قریب
 تھی۔ میں جس راستے آیا تھا اسی پر چل پڑا۔ چلتے چلتے مجھے
 ٹھوکر لگی۔ جھک کر دیکھا تو یہ ایک نالی بندوق تھی جو میں نے
 بھاگتے ہوئے پھینک دی تھی۔ میں نے اُسے اٹھایا اور چستے تک

پتھ گیا جو ہمارے کیمپ کے قریب پہنچتا تھا۔

ابھی میں کیمپ کی طرف چند ہی قدم گیا تھا کہ مجھے رائفل کی
 گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں بھٹک گیا۔ پہلے تو مجھے خیال
 آیا کہ شاید میرے ساتھی کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں مگر پھر
 سوچا کہ شاید اُنھوں نے یہ سمجھا ہو کہ میں راستہ بھول کر جنگل میں بھٹک
 رہا ہوں اور اُنھوں نے گھر کی سمت بتانے کے لیے گولی چلائی ہو۔
 بہر حال میں نے اپنی چال تیز کر دی تاکہ جلد سے جلد اپنے ساتھیوں
 سے جا ملوں۔

جب فورٹ چلیخچر قریب آ گیا تو میں نے لارڈ جان کو زور سے
 آواز دی تاکہ اُنہیں معلوم ہو جائے کہ میں زندہ سلامت ہوں۔
 لیکن جب اس کے جواب میں خاموشی چھائی رہی تو میں فکر مند
 ہو گیا اور تیزی سے کیمپ کی طرف دوڑا۔ قلعے کا دروازہ کھلا
 ہوا تھا۔ میں پک کر اندر گھسا اور صبح کے جھٹ پٹے میں میری
 آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کے لیے میں ہرگز تیار نہ تھا۔ سارا
 سامان پکھرا پڑا تھا۔ میرے تینوں ساتھی غائب تھے اور مجھے
 بھروسے الاؤ کے پاس بہت سا خون پڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ بس اتنا یاد
 ہے کہ میں دیواروں کی طرح جنگل میں اپنے ساتھیوں کو پکارتا پھر
 لہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اب میں اس خطرناک

جگہ اکیلارہ گیا ہوں اور جلد ہی کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گا۔
 مائوسی کے عالم میں میں کبھی اپنا سر پٹتا تھا اور کبھی بال نوچتا
 تھا۔

تھک ہار کر میں پھر کمپ میں واپس آیا اور اپنے حواس
 بٹھیک کر کے اندازہ لگانے لگا کہ یہ ہوا کیا؟ سامان کی بے ترتیبی
 بتاتی تھی کہ کمپ پر حملہ ہوا ہوگا۔ رائفل چلنے کی آواز اسی وقت
 آئی ہوگی۔ لیکن صرف ایک ہی گولی چلائی گئی جس کا مطلب ہے
 کہ تینوں کو بہت جلد بے قابو کر دیا گیا۔ رائفلیں زمین پر پڑی
 تھیں۔ لارڈ جان کی رائفل میں خالی کارٹوس لگا تھا۔ سمرفی اور
 چلیجر کے کبیل الاؤ کے پاس پڑے تھے، جہاں وہ سوئے تھے
 باقی سارا سامان بھی پکھرا پڑا تھا مگر کوئی چیز غائب نہ تھی۔ اس
 کا مطلب یہ تھا کہ حملہ جانوروں نے کیا تھا انسان ہوتے تو وہ
 کچھ سامان ضرور ساتھ لے جاتے۔

میں دوبارہ انھیں جنگل میں ڈھونڈنے گیا اور اس بار راستہ
 بھی بھول گیا۔ آخر گھنٹا بھر بھٹکنے کے بعد چشمے تک پہنچا اور
 وہاں سے کمپ آگیا۔ ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔

اتنے میں مجھے زہبو کا خیال آیا جو نیچے موجود تھا۔ میں سطح
 مرتفع کے کنارے پر گیا۔ زہبو بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک
 آدمی اور تھا۔ مہری آواز سننے ہی وہ مخروطی پہاڑی پر آگیا اور

اس نے بتایا کہ جن ملازموں کو ہم نے واپس بھیجا تھا ان میں سے
 ایک کا سامان دوسروں نے چھین لیا چنانچہ وہ واپس آگیا ہے
 اور آپ کو ٹی خط بھیجیں تو لے جائے گا۔

میرے پاس دو خط تو تیار تھے۔ تیسرا خط لکھنے کے لیے مہلت
 درکار تھی۔ اس لیے میں نے زہبو سے شام کو آنے کو کہا اور اب
 تک کے واقعات لکھنے بیٹھ گیا۔ شام کو زہبو آیا تو میں نے تینوں
 خط ایک پتھر میں باندھ کر اس تک پھینک دیے اور اپنا بٹو بھی
 پھینک دیا جس میں تین اشرفیاں تھیں۔ میں نے کہا۔

یہ اشرفیاں اس آدمی کو دے دو اور کہو کہ گاؤں سے چمڑے
 کے بنے ہوئے بلے بلے رستے لے آئے تو دو گنا انعام ملے گا۔

آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پھرے پر کھرنچے پڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خون نکل کر جم گیا تھا اور کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے۔

میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر انہوں نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔ دور انقلیں خود سنبھالیں۔ دو بجھے دیں۔ پھر جلدی جلدی جیبوں میں کارتوس بھرے اور بولے۔

جلدی کرو۔ کچھ کھانے پینے کا سامان اور زیادہ سے زیادہ کارتوس ساتھ لے لو۔ اور جلدی چلو۔

آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں تقریباً بھاگتے ہوئے روانہ ہوئے۔ وہ مجھے بائیں طرف اس علاقے میں لے گئے جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے درمیان ذرا سی صاف جگہ تھی۔ یہاں انہوں نے ایک پناہ گاہ بنالی تھی۔ کیمپ تو اب غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے سب سامان رکھا اور پھر لارڈ جان سے پوچھا۔

”چیلنجر اور سمرلی کہاں ہیں؟“ آخر یہ قصہ کیا ہے؟“

انہوں نے جواب دیا: ”کچھ نہ پوچھو۔ یہ بن مانس تو اس قدر وحشی ہیں کہ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اور ہاں آہستہ بولو۔ ان کم بختوں کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے پورا قصہ سنایا۔ کہنے لگے۔

”صبح ہونے والی تھی۔ ہم لوگ جاگ چکے تھے لیکن ابھی اٹھے

بن مانسوں کی قید میں

میں بے حد تھکا ہوا تھا اور ساتھیوں کی گم شدگی کا غم اس سے بھی زیادہ جان لیوا تھا۔ کیمپ میں قطعاً جی نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن رات کے وقت جنگل میں نکلنے کی بھی کوئی تمک نہیں تھی۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ جو جانور کل رات آیا تھا وہ شاید آج پھر آئے۔ یہ سوچ کر میں نے کھانا کھا کر ایک کے بجائے تین الاؤ مٹھت کی شکل میں جلائے اور ان کے درمیان میں لیٹ گیا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی۔

صبح کو پو پھٹ رہی تھی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا میں ہڑبڑا کر اٹھا اور فوراً رائفل پر ہاتھ ڈالا لیکن دوسرے ہی لمحے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ میرے پاس لارڈ جان گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھیں مل کر انہیں دیکھا۔ صبح وہ لارڈ جان ہی تھے لیکن اُت میرے مُدا۔ کل کے لارڈ جان اور آج کے لارڈ جان میں کتنا فرق تھا۔ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

نہیں تھے کہ اچانک درخت پر سے بن مانس گودنا شروع ہو گئے۔ وہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ میں نے ایک بن مانس کے گولی مار دی جو اُس کے پیٹ میں لگی لیکن اس سے زیادہ موقع نہ مل سکا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے ذہین جانور نہیں دیکھے۔ وہ ڈنڈوں اور پتھروں سے مسلح تھے اور آپس میں باقاعدہ باتیں کرتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ہاتھ پشت پر لا کر انھوں نے پتلی پتلی بیلوں سے کس کر باندھ دیے۔ کم سخت بلا کے طاقت ور تھے۔ ان میں کچھ بن مانس اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر لے گئے۔ بعد میں بڑے بوڑھے بن مانسوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔

میں نے بے چینی سے پوچھا: پھر کیا ہوا؟

لارڈ جان نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ چیلینجر اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر اٹھیں کوسنے دے رہا تھا۔ میں تو یہ سمجھا کہ بس اب یہ ہمیں مار ڈالیں گے مگر وہ آپس میں باتیں ہی کرتے گئے۔ اور ہاں ایک مزے کی بات تو میں نے بتائی ہی نہیں۔ اُن کا سردار ہو ہو چیلینجر کی طرح تھا۔ ویسا ہی جسم، وہی گردن اور اسی سے ملتا جلتا چہرہ۔ حتیٰ کہ داڑھی تک اسی طرح کی تھی۔ شاید وہ لوگ بھی اشارے کر کے اسی کا ذکر کر رہے تھے اس لیے کہ اُن کا سردار چیلینجر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے چیلینجر کی

گردن کے گرد اپنا بازو ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر اس حالت میں بھی سمرلی پر تمقنوں کا دورہ پڑ گیا جس سے چیلینجر کو غصہ آ گیا اور وہ سمرلی پر بکنے جھکنے لگا۔

پھر کیا ہوا؟ میں اس تفصیل سے بھنچھلا اٹھا تھا اور یہ جانتا چاہتا تھا کہ سمرلی اور چیلینجر زندہ ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کہاں ہیں۔ لارڈ جان نے بتایا۔ آخر وہ لوگ ہمیں لے چلے۔ مجھے اور سمرلی کو تو پیدل لے جایا گیا لیکن چیلینجر کو چار بن مانسوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے کسی شہنشاہ کی سواری جا رہی ہو۔

لارڈ جان نے اتنا ہی کہا تھا کہ دور سے ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی چیز ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجاتی جا رہی ہو۔ لارڈ جان نے کہا۔ یہ وہی بن مانس ہیں۔ غصے میں سب بل کر اپنے دانت لگاتے ہیں تو ایسی ہی آواز آتی ہے۔ اُن کی ٹولیاں ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ آواز مت نکالو۔

ہم نے رات فلیں سنبھال لیں اور دیک کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ آوازیں دور چلی گئیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد لارڈ جان نے پھر اپنی داستان شروع کی۔

”وہ لوگ تین چار میل دور ہمیں اپنی بستی میں لے گئے۔ وہاں درختوں کے ایک بڑے جھنڈ تلے اُن کی کم سے کم ایک ہزار

جھونپڑیاں ہیں۔ وہاں انہوں نے مجھے اور سمرلی کو اٹھا کر کے درختوں سے باندھ دیا۔ لیکن چلیجیر کی بڑی خاطر میں ہو رہی تھیں۔ اُسے طرح طرح کے پھل کھا لائے جا رہے تھے اور وہ بڑا خوش تھا بن مانسوں کے سردار کے ساتھ اُس کا وقت بڑے مزے میں گزر رہا تھا۔

میں لارڈ جان کو مختصر طور پر بتا چکا تھا کہ یہاں آدمی بھی موجود ہیں لیکن انہیں مجھ سے زیادہ باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے بتایا۔

”اس علاقے کے ایک جانب انسان بستے ہیں اور دوسری طرف بن مانسوں کا راج ہے اور دونوں میں سخت دشمنی ہے۔ کل بن مانس ایک دیجن انسانوں کو کیس سے پکڑ لائے تھے۔ وہ چھوٹے قدر اور مرنج رنگ کے انسان تھے۔ بن مانسوں نے جاگہ گاٹ کر اور نوچ کر انہیں اتنا زخمی کر دیا تھا کہ ان سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ میرے سامنے دو بن مانسوں نے ایک آدمی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے اور دو ٹکڑے کر ڈالا۔ کسی کو قتل کرنے کا اس سے زیادہ ظالمانہ طریقہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ سمرلی تو بے ہوش ہو گیا اور چلیجیر کی بھی حالت خراب ہو گئی۔ تم خوش قسمت ہو کہ بن مانسوں کے ہاتھوں سے بچ گئے۔ پھر کیا ہوا؟ میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔“

”تمہیں اُس سطح مرتفع کے نیچے وہ بانسوں کا جھنڈ یا دہے جس میں الجھا ہوا سفید نام باشندے کا ڈھانچا ملا تھا۔“

”ہاں ہاں۔“

بانسوں کا یہ جھنڈ بن مانسوں کی بستی کے عین نیچے ہے۔ یہاں سے وہ اپنے قیدیوں کو نیچے پھینک کر تماشا دیکھتے ہیں۔ اگر ہم بانسوں کے اُس بڑے جھنڈ کا اچھی طرح جائزہ لیں تو یہیں ہاں بہت سی انسانی ہڈیاں ملیں گی۔

یہ سن کر خوف کی ایک ٹھنڈی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ لارڈ جان نے کہا۔

”بن مانس اس تماشے کا باقاعدہ انتظام کرتے ہیں۔ ان کی پوری قوم قطار باندھ کر تماشا دیکھنے کنارے پر موجود تھی۔ مجھے اور سمرلی کو بھی وہاں لے جایا گیا۔ انہوں نے چار انسانوں کو ایک ایک کر کے گودنے پر مجبور کیا اور چاروں کے جسم تیز زونگیلے بانسوں میں چھد کر رہ گئے۔ چھ انسانوں کو انہوں نے آج کے لیے بچا لیا اور میرے خیال میں مجھے اور سمرلی کو بھی وہ آج ہی پھینکنے والے تھے۔ چلیجیر کو شاید نہ پھینکتے۔“

”پھر آپ کیسے بچ نکلے؟ میں نے پوچھا۔“

”میں نے یہ تاڑ لیا تھا کہ بھلے ہی یہ بن مانس ہم سے زیادہ طاقتور ہوں، کم سے کم ہم سے زیادہ تیز دوڑتے تو نہیں سکتے۔ اس لیے کہ

آن کی ٹانگیں خم کھائی ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ انہیں بندوق کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کا ایک ساتھی میری بندوق سے مارا گیا ہے تو وہ ساری بندوقیں توڑ ڈالتے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ بندوقیں ہماری ہاتھ آجائیں تو سچنے کا موقع ہے۔

”بس آج صبح میں نے موقع پا کر اپنے پرے داربن مانس کے پیٹ میں زور سے لات ماری اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں بھاگ کر تمہارے پاس پہنچ گیا۔“

”اور سمرلی اور چلیخبر کیوں نہیں بھاگے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”سمرلی تو اس قابل ہی نہ تھا اور چلیخبر درخت پر بن مانسوں کے سردار کے ساتھ تھا۔ وہاں سے اتر کر بھاگنا مشکل تھا۔“

ظاہر ہے کہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش ضروری تھی۔ ہم نے بندوقیں سنبھالیں۔ کارٹوس ہماری جیبوں میں پہلے سے موجود تھے مگر جیسے ہی ہم باہر نکلے لارڈ جان نے گھبرا کر کہا۔ بن مانس آپہنچے۔

میں نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا۔ کچھ دور پر بن مانسوں کی ایک ٹولی قطار بناٹے جا رہی تھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے جاتے تھے جیسے ہماری تلاش میں ہوں۔ سب کے ہاتھوں میں موٹے موٹے

ڈنڈے تھے۔

ہم لوگ دوبارہ اپنی پناہ گاہ میں دیک گئے اور خوراک کا ایک ڈبا کھول کر ناشا کرنے لگے۔ جب خطرہ ٹل گیا تو احتیاط سے دوبارہ باہر نکلے۔ آگے آگے لارڈ جان تھے اور پیچھے پیچھے ہیں۔ کچھ دور چل کر لارڈ جان رُکے اور اٹھنوں نے آہستہ سے کہا۔

”درختوں میں وہ ہم پر بھاری پڑیں گے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ اچانک اُدپر سے ہم پر گڑٹ پڑیں گے۔ میدان میں ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اس لیے کوشش کرو کہ ہم میدان ہی میدان آگے بڑھیں۔“

آخر ہم ایک چکر کھا کر میدان میدان چلے اور ان کی بستی کے پاس پہنچ گئے۔ بن مانس قطار باندھے کھڑے تھے اور کوئی بھی قطار توڑنے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ پانچ چھ جنگلی آدمی سمے ہوئے وہاں موجود تھے۔ میں نے چلیخبر کو بھی دیکھا۔ اُس کے کپڑے تازا ہو چکے تھے اور ہیٹ غائب تھا۔ اُس کے قریب ہی بن مانسوں کا سردار کھڑا تھا اور واقعی لارڈ جان نے ٹھیک کہا تھا۔ دونوں میں بال برابر فرق نہ تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو بن مانسوں نے ایک جنگلی آدمی کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کنارے کی طرف لے چلے۔ وہاں پہنچ کر ایک نے اُس غریب کا ایک ہاتھ پکڑا، دوسرے نے ایک

ٹانگ اور تین مرتبہ جھلا کر زور سے اچھال دیا۔ ایک چیخ بکند ہوئی جو ڈوبتی چلی گئی۔ بن مانس مارے خوشی کے گودنے اور شور مچانے لگے۔

وہ اس تماشے میں اتنے محو تھے کہ انہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں کی اور ہم ان کے بہت قریب پہنچ گئے۔ اب دو بن مانسوں نے سمرلی کو پکڑا اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ چیلنجر ان کے سردار کی منتیں اور خوشامدیں کرتا رہا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رہی۔ سردار نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

دوسرے ہی لمحے لارڈ جان کی رائفل سے ایک شعلہ نکلا اور بن مانسوں کا سردار زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ لارڈ جان نے مجھ سے کہا۔

”گولی چلا ڈبیٹے۔ دیکھتے کیا ہو۔“

میں یوں تو کافی رحم دل ہوں اور خون بہانا مجھے پسند نہیں لیکن اس وقت تو میرے سر پر جیون سوار تھا۔ بڑی تیزی سے میں گولیاں چلانے لگا۔ لارڈ جان مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے ایک کے بعد دوسرا کارتوس خالی کر رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ دو بن مانس مارے گئے جو سمرلی کو پکڑے ہوئے تھے اور پھر تلے اوپر جولاہیں گریا شروع ہوئیں تو بن مانسوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چینتے چلتے

پناہ لینے کے لیے ددختوں کی طرف بھاگے۔

چیلنجر نے سمرلی کا بازو تھاما اور وہ دونوں ہماری طرف دوڑے۔ دو بن مانس ان کے پیچھے بھاگے مگر لارڈ جان کی دو گولیوں نے ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ہم چاروں بندوقیں ساتھ لائے تھے۔ چیلنجر اور سمرلی کے آتے ہی ان کی بندوقیں ہم نے انہیں دے دیں لیکن بے چارہ سمرلی بندوق چلانے کے قابل ہی نہ تھا۔

اب بن مانس بھی سنبھل گئے اور وہ ایک بڑا سا حلقہ بنا کر ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اور چیلنجر نے سمرلی کو بیچ میں لے لیا اور سہارا دیتے ہوئے دوڑنے لگے۔ لارڈ جان پیچھا کرنے والے بن مانسوں کو روکنے کے لیے ان پر گولیاں بھی برساتے جا رہے تھے اور بھاگتے بھی جا رہے تھے۔ کوئی ایک میل تک انہوں نے ہمارا پیچھا کیا مگر پھر انہیں بندوق کی طاقت کا علم ہو گیا اور وہ لوٹ گئے۔ ہم لوگ کیمپ میں پہنچ گئے لیکن عین اسی وقت قدموں کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو وہ چاروں جنگلی آدمی جو بچ گئے تھے بے سحاشا بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے سامنے آ کر وہ ہاتھ جوڑ کر پیٹ کے بل بلے بلے لیٹ گئے۔ خوف سکان کے بدن کانپ رہے تھے۔

ان میں سے ایک بڑھ کر لارڈ جان کے پیروں سے لیٹ گیا۔ اور جب لارڈ جان نے اسے اٹھایا تو اس نے اشارے سے بتایا

خوف زدہ تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ بڑی تعداد میں ایک ساتھ ہم پر ہلا بول دیتے تو ہماری چار بندوقیں کیا کر لیتیں؟
 کیمپ سے نکل کر ہم اپنی ننھی پناہ گاہ میں پہنچ گئے اور ایک ایک بندوق لینے کا فیصلہ کیا۔ چاروں جنگلی بھی سو گئے۔ سمرلی کو تو سب سے پہلے بندوق آئی۔ لارڈ جان بھی سو گئے۔ میں ابھی اُدکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے میری آستین پکڑ کر کھینچی۔ دیکھا تو چیلنجر تھے۔ بڑے دوستانہ لہجے میں مجھ سے کہنے لگے۔

”تم یہاں کے سارے واقعات لکھ رہے ہو۔ کیوں؟“
 ”بے شک۔ اخباری رپورٹروں کا اور کام ہی کیا ہے؟“
 ”تم نے لارڈ جان کی وہ بات سنی ہوگی۔ وہی بن مانسوں سے میری مشابہت والی؟“

میں نے سر ہلایا تو چیلنجر نے آہستہ سے ہدایت کی۔ اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر مت کرنا۔ یہ فضول سی بات ہے۔ بالکل واپس بات۔ یہ ہدایت دینے کے بعد چیلنجر پھر لیٹ گئے اور اطمینان سے خڑائے لینے لگے۔ جلد ہی میری بھی آنکھ لگ گئی۔

کہ اس جنگل میں ٹھہرنا سخت خطرناک ہے۔ ہم نے اپنی بندوقوں کی طرف اشارہ کر کے انہیں تسلی دی کہ اس سے ہم ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس پر وہ چاروں ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سمرلی نے میرا اور لارڈ جان کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے ان کی جان بچائی۔ چیلنجر کہنے لگے۔

”تمہارا یہ احسان سائینس کی گردن پر ہے۔ مجھ جیسے آدمی کی موت سے سائینس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔“

یہ کہہ کر چیلنجر نے گوشت کا ایک ٹین کھولا اور ہر جھکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ چاروں جنگلی پھر دوڑ کر لارڈ جان کے قدموں سے لپٹ گئے اور خوف زدہ ہو کر چیلنجر کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ لارڈ جان نے ایک زوردار تہقہ لگا کر چیلنجر سے کہا۔

”لو اور سنو، یہ غریب تمہیں بن مانس سمجھ کر ڈر رہے ہیں اور یقین جانو تم میں اور بن مانسوں کے سردار میں ذرہ برابر فرق نہیں۔“
 ”مجھے معلوم تھا کہ جنگلی اس علاقے کے دوسرے کنارے پر آباد ہیں جو یہاں سے کوئی بیس میل دور تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے لیے بھی وہی جگہ محفوظ ہوگی۔ ہم نے اپنا سامان سنبھالا اور روانہ ہو گئے۔ سمرلی کی حالت خراب تھی۔ انہیں ہمارے سہارے چلنا پڑ رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ہم نے بن مانسوں کی آوازیں سنی ہیں لیکن وہ ہمارے سامنے نہیں آئے۔ شاید ڈر گئے تھے۔ لیکن اپنی جگہ ہم بھی

پناہ میں پہنچنے کے بعد ہم اطمینان سے
پیل دہائیت لینڈ کے بارے میں اپنی تحقیق مکمل کر لیں گے۔ اس کے
بعد یہاں سے واپسی کے بارے میں سوچیں گے۔

یہ جنگلی چھوٹے قد کے ڈبے تیلے، کمزور سے آدمی تھے لیکن ان میں
بلا کی پھرتی تھی۔ اپنے بالوں کو پچھے کر کے اٹھوں نے چہرے کی پٹیوں
سے کس رکھا تھا۔ اور وہ چہرے کی ہی لنگوٹیاں باندھتے تھے۔ ان
کے ڈاڑھی موٹھیں نہیں تھیں اور کانوں کی لہریں چری ہوئی اور زخمی تھیں
جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی زیور پہنے ہوئے تھے جسے بن مانسوں
نے بھینچ کر نکال لیا تھا۔ ان کی زبان ہماری سمجھ میں نہ آتی تھی۔
لیکن وہ آپس میں بڑی روانی سے بات چیت کرتے تھے۔ بار
بار وہ اپنی اور ایک دوسرے کی طرف اشارہ کر کے لفظ "اکالا"
کتے تھے۔ جس سے ہم سمجھ گئے کہ وہ اپنی قوم کو اکالا کہتے ہیں۔
ٹھیاں بھینچ کر وہ جنگل کی طرف اشارہ کر کے لفظ ڈوڈا
ڈوڈا چلاتے تھے یعنی اپنے دشمن بن مانسوں کو وہ ڈوڈا
کہتے تھے۔

لاڈو جان نے کہا۔ چیلنجر تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا
خیال ہے؟

چیلنجر نے جواب دیا۔ ان میں یہ آدمی جس کا سر مسدا ہوا ہے، ان
کا سردار معلوم ہوتا ہے۔

خوف ناک جنگ

ہمارا خیال تھا کہ بن مانسوں کو ہماری اس پناہ گاہ کا کوئی علم
نہ ہوگا لیکن جلد ہی ہمیں اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا۔ جنگل میں
بالکل خاموشی تھی۔ جیسی کہ پناہ گاہ کی آواز بھی نہ آتی تھی لیکن
جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے تجربہ ہو چکا تھا۔ بن مانس پورا منصوبہ بنا کر
اجانک حملہ کرنے کے عادی تھے۔ غرض اس صبح موت میرے
جتنی نزدیک سے گزری اتنی نزدیک اس سے پہلے کبھی نہیں آئی
تھی۔ پھر یہ بات میں ذرا تفصیل سے بتاؤں گا۔

صبح کو ہم سب اٹھے تو پوری طرح تازہ دم نہیں ہوئے تھے اور
سمرلی کی توڑی سے بھی طبیعت خراب تھی لیکن بوڑھا ہمت کا پتلا
تھا۔ ایسی ہمت جو کبھی شکست نہیں کھاتی۔

ہم نے طے کیا کہ ناشتا کر کے جنگلیوں کے غاروں کی طرف روانہ
ہو جائیں گے۔ جن چار آدمیوں کی ہم نے جان بچائی تھی ان کا رونا
ٹواں ہمارا شکر گزار تھا اور ہمیں یقین تھا کہ ان کی پوری بستی ہمیں

اور یہ واقعہ تھا کہ وہ آدمی باقی تینوں سے الگ الگ رہتا تھا باقی تینوں اُس سے بات کرتے تو بڑے ادب سے کرتے تھے۔ وہ ان سب سے کم عمر تھا۔ اس کے باوجود بڑا مغرور تھا۔ جب چلیخ نے اس کے منڈے جوڑے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ غصے سے کچھ کٹنا ہوا الگ ہٹ گیا۔ پھر ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بڑے فخر سے اس نے کئی بار لفظ "ارٹاس" کہا۔

چلیخ نے سمجھا یا کہ یہ انسانی نسل جنوبی امریکہ کے دوسرے جنگلی قبیلوں کے مقابلے میں ذہنی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اسی طرح یہاں کے بن مانس بھی دنیا میں پائے جانے والے بندروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہیں۔ اس جگہ جہاں جانور ابھی ارتقا کی بالکل ابتدائی منزلوں میں ہیں، ان دد ترقی یافتہ نسلوں کا وجود اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ کسی طرح باہر سے یہاں پہنچے اور پھر لوٹ کر نہ جاسکے۔

یہ سن کر مجھے جھنجھری سی آگئی۔ گویا ہم بھی یہاں سے واپس نہ جاسکیں گے۔ چلیخ کی تقریر خاصی دیر جاری رہی جس سے سمری نے اختلاف کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ بات بڑھ نہ جائے ان کی توجہ دوسری طرف بٹانے کے لیے کہا۔ ارے، چوتھا جنگلی کہاں غائب ہو گیا؟

لاڈ جان نے بتایا میں نے اُسے گوشت کا ایک خالی ڈبا دے کر چشمے سے پانی لانے بھیجا ہے۔ آتا ہی ہوگا۔

لیکن جب اُسے آنے میں خاصی دیر ہو گئی تو میں رائفل لے کر اُسے ڈھونڈنے نکلا۔ چشمہ وہاں سے کوئی دو سو گز دور تھا۔ چشمے کے بننے کی آواز آرہی تھی۔ درختوں کا آخری جھنڈ میرے اور چشمے کے درمیان تھا کہ اچانک میری نظر اس جھنڈ کے نیچے زمین پر کسی لال لال چیز پر پڑی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ اُس جنگلی کی لاش تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ شانے پر سے اکھڑا ہوا تھا اور گردن مروڑی گئی تھی۔ میں نے چیخ مار کر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا اور پناہ گاہ کی طرف بھاگا۔ میرے مرنے میں کچھ کسر نہیں رہ گئی تھی مگر خدا جانے کس وقت کی نیکی کام آگئی کہ اچانک میری نظر اُد پر اُٹھ گئی اور میں جھٹ سر جھکا کر چیخ گیا۔ دو لال لال ہاتھ میرا گلا گھونٹنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایک بن مانس درخت کی ڈال میں اٹاٹک کر یہ حرکت کرنے والا تھا۔

اس سے تو میں بچ گیا لیکن اس کے بعد اُس نے کچھ اور نیچے آکر ایک ہاتھ میری گدی میں ڈال دیا اور دوسرا میرے چہرے پر رکھ کر مجھے زمین سے اٹھا لیا۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا سر پیچھے کی طرف موڑا جا رہا ہے مجھے اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ جو اس جاتے رہے۔ اس کے باوجود میں دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ جس نے میری ٹھوڑی کو پکڑ رکھا تھا ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور کانوں میں گھنٹیوں

کی سی مدھم آواز آ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں مرنے والا ہوں کہ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی اور پھر ان ہاتھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں پناہ گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ لارڈ جان میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ نہ جانے ان میں سے کون جا کر پانی لایا تھا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے میں میں ٹھیک ہو گیا صرف گردن میں درد باقی تھا۔

لارڈ جان نے بتایا۔ تمہاری پیچ سُن کر میں بندوق لے کر باہر نکلا۔ میں نے دیکھا بن مانس تمہارا سر مردڑ رہا ہے۔ میں تو سمجھا کہ ہم میں سے ایک گیا۔ تاہم میں نے گولی چلا دی۔ نشانہ خطا ہو گیا لیکن بن مانس ڈر کے مارے تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ بن مانسوں نے ہماری پناہ گاہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ ادھر ادھر تک میں لگے ہوئے تھے تاکہ کوئی اکاڈکا آدمی باہر نکلے تو اسے مار ڈالیں۔ ایک جنگلی کو آٹھوں نے مار ہی ڈالا۔ میں بھی مرتے مرتے بچا تھا۔ لہذا اب فوراً یہاں سے چل دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

ہمیں اپنا پھلا کیپ فورٹ چیلنجر چھوڑنے کا غم تھا۔ اس لیے بھی کہ وہاں اب بھی کافی سامان تھا اور اس لیے بھی کہ وہاں سے ہم زبوں سے مدد لے سکتے تھے لیکن ہمیں یقین تھا کہ موقع پا کر ہم

دوبارہ اپنے قلعے میں واپس آسکیں گے۔

سب سے آگے نوجوان جنگلی سردار تھا جو ہماری رہنمائی کر رہا تھا اس نے سامان اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے پیچھے دو جنگلی تھے جو ہمارا سامان اٹھاتے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ہم چاروں تھے۔ ہمارے پاس بھری ہوئی بندوقیں تھیں اور بڑی احتیاط سے ہر طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ کوئی گیارہ بجے دن کو ہم روانہ ہوئے تھے۔

جب ہم جنگل پار کر رہے تھے تو ہم نے بن مانسوں کے ہنسنے کی آواز سنی۔ وہ ہمارے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی خوشی منا رہے تھے ہم نے ادھر ادھر دیکھا لیکن ہرے ہرے پتوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بہر حال اٹھوں نے ہمارا پیچھا نہیں کیا اور جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں آگئے جہاں صرف جھاڑیاں تھیں اور اب بن مانسوں کے اچانک حملے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

شام سے ذرا پہلے ہم جھیل تک پہنچ گئے۔ ہمارے جنگلی ساتھیوں نے جھیل کی طرف دیکھ کر خوشی کا نعرہ مایا۔ ہم نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا ایک بڑا کنارے کی طرف آ رہا ہے۔ ابھی کشتیاں کسی میل دور تھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ قریب آ گئیں۔ یہ جنگلی بڑے ماہر ملاح تھے۔ کشتی والوں نے جب نوجوان سردار کو زندہ سلامت دیکھا تو خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ جلد جلد کنارے پر پہنچ کر وہ

کشتیوں سے گود پڑے اور نوجوان سردار کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔

ان میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس نے گلے میں کپڑے کے موتیوں کا ہار پہن رکھا تھا اور جس کے ہاتھوں میں بھی ویسے ہی کڑے تھے۔ اُس کے جسم پر کسی خوب صورت جانور کی کھال کا لبادہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر نوجوان سردار کو گلے سے لگا لیا۔ پھر ہمارے بائیں میں سوالات کیے۔ نوجوان نے اُن کے جواب دیے۔ اس کے بعد وہ بوڑھا بڑے وقار سے آگے بڑھا اور باری باری اُس نے ہم سب کو گلے لگایا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ بوڑھا 'اکالا' قوم کا بادشاہ ہے اور ہم نے ولی عہد کی جان بچا کر پوری قوم پر احسان کیا ہے۔ اُن کی زبان میں ولی عہد کو 'مارٹیاں' کہا جاتا تھا۔

یہ جنگی جنگ کے لیے تیار ہو کر آئے تھے اور غالباً اپنے ولی عہد کو اٹھالے جانے کے جرم میں بن مانسوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بانس کے بنے ہوئے نیز بڑھے تھے، کندھوں پر کمانیں لٹک رہی تھیں اور تیروں سے بھرے ہوئے ترکش سب کے پاس تھے۔ ان کی گفتگو میں بار بار لفظ 'ڈوڈا' آ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈوڈا یعنی بن مانسوں کی قوم کو سزا دینے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

اُسی وقت بادشاہ کی صدارت میں جنگی کونسل کا اجلاس ہوا۔

جس میں کئی آدمیوں نے جویشی تقریریں کیں۔ سب سے جویشی تقریر ہمارے نوجوان دوست ولی عہد نے کی جس میں بار بار ہمارا حوالہ دیا گیا۔ شاید وہ کہہ رہا تھا کہ ایک آخری جنگ لڑ کر بن مانسوں کو ختم کر دیا جائے۔ ہمارے یہ دوست جن کے پاس جادو کے زبردست ہتھیار ہیں ہماری مدد کریں گے اور اُن کی مدد سے ہم یہ بڑائی چیت لیں گے۔

تقریر ختم ہونے پر جنگ جوجوانوں نے اپنے برچھے ہلا کر نعرے لگائے۔ وہ سب جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اُن کے بادشاہ نے ہمارے پاس آ کر جنگ کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ لارڈ جان نے ہم سے کہا۔

'ان بن مانسوں نے ہمیں بھی کچھ کم نہیں ستایا ہے۔ بہتر ہے اس جنگ میں ہم اکالا قوم کا ساتھ دیں اور ڈوڈا قوم سے انہیں مکمل چھٹکارا دلادیں۔ یہ انسانیت پر بڑا احسان ہو گا۔'

مختصر سی بحث کے بعد ہم اس پر تیار ہو گئے۔ یہ رائے اس لیے بھی ٹھیک تھی کہ بن مانسوں سے خود ہمیں بھی مستقل خطرہ تھا۔ بات طے ہو جانے کے بعد لارڈ جان نے اکالا قوم کے بادشاہ کو اشاروں سے بتایا کہ ہم تیار ہیں اس پر سارے جنگیوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔

اب رات ہو چلی تھی۔ جنگیوں نے جگہ جگہ الاؤ جلا لیے تھے۔

اس کے بعد کچھ لوگ ایک سبزی خوردنی نو سا کو ہنکاتے ہوئے لائے۔ اُس کے شانے پر راکھ کے رنگ کا گول سا نشان بنا تھا۔ ارباب ہمیں پتا چلا کہ یہ جانور ان کے پالتو مویشی ہیں جن کا گوشت ان کی خورداک ہے۔ جس طرح ہم اپنی بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں پر شناخت کے لیے نشان لگا دیتے ہیں اسی طرح ان کے ہاں بھی یہ دستور ہے۔

یہ جانور بڑا بے ضرر تھا۔ بڑی آسانی سے اسے ذبح کر ڈالا گیا اور اس کا گوشت لگا بونی کر کے آگ پر بھونا جانے لگا۔ کچھ آدمیوں نے اپنے برچھے بھونک بھونک کر بھیل سے مچھلیاں بھی پکڑ لی تھیں انھیں بھی بھونا جا رہا تھا۔ جب تک کھانا تیار ہوتا رہا ہم ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ہمیں وہ چھوٹا سا چشمہ بھی ملا جس سے گیس نکل رہی تھی۔ چیلنجر نے ایک نرکل توڑ کر اُس میں گیس بھری اور پھر ماچس سے اسے جلایا۔ گیس بھک سے اڑ گئی۔ اس کے بعد چیلنجر نے جیب سے پتلے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی۔ اس میں گیس بھر کر اس کا منہ باندھ کر چھوڑ دیا تو وہ اُڑتی چلی گئی۔

اس کے بعد ہم واپس آگئے۔ اتنے آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا دیکھ کر کس جانور کی نسبت تھی کہ قریب آتا۔ صرف چند ٹیڑھوں کے اپنے بڑے بڑے پر پھیلنے آسمان پر جکر لگا رہے تھے۔ لیکن جمیل کی سطح پر بڑا ہنگامہ تھا۔ طرح طرح کے پانی کے جانور اُچھل

رہے تھے۔ اُس کے اندر ریتلے ٹاپوؤں پر بڑے بڑے کچھوے اور دوسرے جانور پڑے ہوئے تھے۔ ایک جانور بڑا عجیب تھا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ چمڑے کا بڑا سا گدلا ہے جو آہستہ آہستہ پانی کی طرف کھسک رہا ہے۔ پانی میں بڑے بڑے سانپ بھی تھے جو بار بار اپنا بھیانک منہ اُپر نکال کر ادھر ادھر دیکھتے اور پھر ڈبکی مار جاتے۔ اُن میں سے ایک سانپ تشکی پر چڑھا آیا۔ سانپ کیا تھا اچھا خاصا اژدہا تھا۔ اس کا جسم ایک بڑے پیسے کی طرح تھا جس کے دو بڑے بازو تھے جو چوڑے پتواریوں کی طرح تھے۔ اس پیسے میں سانپ کی سی لمبی گردن تھی اور دوسرے سر پر ایک بھیانک سر تھا جس پر دو سینگ بھی تھے۔

چیلنجر اور سمری اُسے دیکھ کر پھر ک اٹھے۔ چیلنجر نے کہا: آہا، ایسی سارس۔ میٹھے پانی کا ایسی سارس۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ اس زمانے کا کوئی انسان ایک زندہ ایسی سارس دیکھ سکے گا۔ دونوں سائنس دان نہ جانے کب تک ایسی سارس پر بحث کرتے رہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کھانے کا بلوا آ گیا۔ ہم لوگوں نے نہایت لذیذ کھانا کھایا جس میں مزے دار پھل اور کسی جانور کا دودھ بھی تھا جو لکڑی کے پیالوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہم چاروں کو ولی عہد کے ساتھ بٹھایا گیا۔

صبح ہم سو کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ رات کو غاروں سے تازہ نمک

آگئی تھی ادرا ب فوج کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہوگی۔
بادشاہ کے حکم پر روانگی شروع ہوئی۔ جب بن مانسوں کی بستی
قریب آگئی تو سب لوگوں نے ایک بڑا سا گھیرا بنا لیا۔ آگے بڑھوں
والے تھے اور ان کے پیچھے تیرکمان والے۔ بادشاہ اور ولی عہد
درمیان میں تھے۔ لارڈ جان اور سمرلی دائیں طرف ہو گئے اور میں اور
چیلنجر بائیں جانب۔

اچانک بن مانسوں کی بستی میں شور مٹھا اور ان کی ایک ٹولی
جو ڈنڈوں اور پتھروں سے لیس تھی ہماری فوج کے درمیان جھڑپوں پر
حملہ آور ہوئی۔ بن مانسوں کی رفتار تیز نہ تھی اور جنگلی بلاکے پھرتیلے
تھے۔ انھوں نے بن مانسوں کو تیروں سے چھبڈ ڈالا۔ ایک زخمی
بن مانس چیتا ہوا میرے قریب سے بھاگا۔ مجھ سے اس کی تکلیف
نہیں دیکھی گئی۔ میں نے گولی مار کر اسے تکلیف سے چھبڈ کا دل دیا۔
اس پہلے تلے میں بس یہی ایک گولی چلائی گئی۔ ہم لوگوں کے لڑائی
میں جھٹہ لینے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

اس لڑائی سے فارغ ہو کر ہم آگے بڑھے۔ اب ہم درختوں تلے
مہنچ گئے تھے۔ یہاں صورت حال دوسری تھی۔ بن مانس اپنے
ڈنڈے لے لے کر اُدپر سے گودتے اور پشتر اس کے کہ کوئی ان کے
برچھا بھونکا وہ دو تین جنگلیوں کا صف بنا کر ڈالتے۔ ایک بن مانس کا
ڈنڈا سمرلی کی بندوق پر پڑا جس سے اس کے پیچھے اڑ گئے۔

دوسرا ڈنڈا خود سمرلی کے پڑنے والا تھا کہ ایک جنگلی نے بن مانس
کے برچھا بھونک دیا۔

بہت سے بن مانس درختوں پر سے پھراؤ کر بے تھے اگر ہماری
بندوقیں نہ ہوتیں تو جنگلیوں کی شکست یقینی تھی۔ لیکن ہم نے بہت
جلد حالات پر قابو پایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بن مانسوں میں بھگدڑ
مچ گئی۔ وہ پیچھے چلاتے بھاگنے لگے۔ فتح مند جنگلیوں نے ان کا
پیچھا کیا اور اپنے تیروں سے انھیں چھیدنا شروع کر دیا۔ اب
لارڈ جان اور سمرلی بھی، جو دوسرے سرے پر تھے ہمارے پاس
آگئے تھے۔

لارڈ جان نے کہا۔ چلو قصہ پاک ہوا
ہم بن مانسوں کی بستی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ راستے میں
بن مانسوں کی لاشیں بلیں جن کے بدن تیروں اور برچھوں سے چھبڈ
ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کسی بد نصیب جنگلی کی لاش بھی پڑی ملی۔
بستی کے پاس پہنچ کر بن مانسوں نے آخری مقابلہ کیا لیکن اس میں
بھی انھیں شکست ہوئی۔ آخر میں کوئی اسی تر باقی رہ گئے تھے۔
جنگلیوں نے ایک گھیرا بنایا اور انھیں کنارے تک لے گئے وہاں
سے اسی طرح انھیں نیچے گودنے پر مجبور کیا جس طرح وہ انسانوں
کو کیا کرتے تھے۔ غرض اس طرح انسانوں اور بن مانسوں کی جنگ
ہو یہاں صدیوں سے چل رہی تھی، ختم ہو گئی۔ بن مانسوں کی ماداؤں

اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ اور پھر فتح کا جشن شروع ہوا۔
 اب ہم اطمینان سے اپنے کیمپ پر بیٹھے اور اپنا بسچا ہوا
 سامان سمیٹا۔ زمبو سے بھی باتیں ہوئیں۔ اُس نے کہا۔
 ”واپس آجائیے جناب۔ وہاں شیطان کی حکومت ہے۔ وہ
 آپ کو مار ڈالے گا۔“
 سمرلی نے کہا۔ ”زمبو ٹھیک کہتا ہے۔ اب ہمیں واپس جانا ہی
 چاہیے۔“

اور پھر ہم نے جلیجھر کو مجبور کیا کہ وہ واپسی کا طریقہ سوچے۔ یہاں
 تک کے واقعات میں زمبو کے پاس شہنشاہ ہا ہوں تاکہ اگر ہم واپس
 نہ آسکیں تو یہ تحریر ہی دنیا تک پہنچ جائے۔

مُخفیہ راستہ

اس جنگ کے بعد ہمارے ٹھاٹھ ہی کچھ اور ہو گئے۔ سارے
 جنگلی ہمارے جاؤو کے ہتھیاروں کے ڈر سے اور ہمارے احسان
 کی وجہ سے ہمارا احترام کرنے لگے لیکن ہمیں یہاں رہنا تو تھا نہیں۔
 ہمیں یہ معلوم تھا کہ کسی زمانے میں نیچے سے اوپر تک ایک مہرنگ
 آتی تھی۔ اسی راستے سے بن مانس اور یہ جنگلی یہاں پہنچے ہوں گے
 اور میسل و ہائیٹ نے بھی آنے اور جانے کے لیے وہی راستہ اختیار
 کیا تھا لیکن بعد میں وہ مہرنگ بند ہو گئی تھی۔ جنگلیوں نے اشاروں
 سے ہمیں بتایا کہ ایک بہت زبردست زلزلہ آیا تھا جس سے یہ مہرنگ
 بند ہو گئی۔

جو بن مانس غلام بنائے گئے تھے اُن سے پانی بھرانے اور
 اور لکڑیاں اکٹھی کرانے کا کام لیا جاتا تھا اور انھیں باندھ کر
 رکھا جاتا تھا۔ جنگلیوں نے ہمیں بھی اپنے غاروں میں رہنے کی
 پیشکش کی لیکن ہم نے غاروں والی پہاڑیوں کے دامن میں زمین

پر ہی اپنا کیمپ بنانا پسند کیا۔
 یہ غار خدا جانے کدورتی تھی یا ان جنگلیوں کی پھلی نسلوں نے
 بنائے تھے بہر حال ان کی ساخت عجیب قسم کی تھی۔ پہاڑی چٹانوں
 کے ایک طرف تیلی ڈھلوان سیڑھیاں اُپر جاتی تھیں۔ کوئی اسی ٹنٹ
 کی بلندی پر ایک قطار میں سارے غار تھے اور غاروں کے سامنے
 چند ٹنٹ چوڑا پلیٹ فارم تھا۔ کوئی خطرناک جانور اس پتلے زمینے پر
 چڑھ کر وہاں نہ پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے کچھ غاروں میں جا کر دیکھا۔ یہ
 اندر سے کٹادہ اور خشک تھے۔ دیواریں ہموار تھیں اور ان پر کوئلے
 سے جانوروں وغیرہ کی تصویریں بنی تھیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ بن مانسوں کے خاتمے کے بعد اب اکالاتوم اس
 سارے علاقے کی مالک ہے اور اب اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔
 لیکن ہمارا خیال غلط نکلا۔ کیونکہ ہمارے وہاں پہنچنے کے تیسرے دن
 ایک خوفناک واقعہ ہوا۔ اُس روز کچھ جنگلی پانی کی چھپکلیوں کا شکار
 کرنے جھیل پر گئے ہوئے تھے۔ چلنی اور سمرلی ان دیوزاد چھپکلیوں کی
 عادتوں وغیرہ کی تحقیق کرنے ان کے ساتھ گئے تھے۔ میں اور لارڈ جان
 کیمپ ہی میں تھے۔ کچھ جنگلی سامنے گھاس کے بڑے میدان میں
 ادھر ادھر مختلف کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک جنگلیوں نے
 چیننا شروع کر دیا۔ سب کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا۔ "اسٹوآ"
 اور پھر مرد، عورتیں اور بچے دیوانہ وار سیڑھیوں کی طرف بھاگے

اور گرتے پڑتے اُپر چڑھنے لگے۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو وہ ہاتھ ہلا
 ہلا کر اور چیخ چیخ کر ہمیں بھی اُپر بلا رہے تھے۔ ہم نے اپنی بندھنیں
 اور کارتوس سمجھالے اور اُپر جانے کے بجائے آگے بڑھے کہ دیکھیں
 معاملہ کیا ہے؟

ابھی ہم گھاس کے میدان کے بیچ میں پہنچے ہی تھے کہ جنگلی سے کوئی
 پندرہ سولہ جنگلی بے تحاشا بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان کے پیچھے دو ویسے
 ہی دیوزاد مینڈک تھے جن میں سے ایک نے ہمارے کیمپ پر حملہ کیا تھا
 اور ایک میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ان کی شکل اور جسم بالکل مینڈک جیسا
 تھا لیکن ڈیل ڈول ہاتھی سے بھی بڑا۔

اس سے پہلے میں نے ان مینڈکوں کو اندھیرے میں دیکھا تھا۔
 اب دن کی روشنی میں دیکھا کہ ان کی چمک دار کھال پر قوس قزح جیسے
 رنگ اور دھبے تھے اور دھوپ میں وہ چمک رہی تھی۔ وہ گود گود
 کر چلتے تھے مگر رفتار خاصی تیز تھی۔ جلد ہی جنگلیوں کو آنھوں نے جا
 لیا۔ وہ گود کر اپنے شکار پر جا گرتے۔ وہ بے چارہ کچل کر فوراً
 ہلاک ہو جاتا۔ یہ اسے نکل کر فوراً اگلے شکار پر چھپتے۔

بے چارے جنگلی جان کے خوف سے ادھر سے ادھر بھاگ
 رہے تھے لیکن بچنا محال تھا۔ اب پانچ چھ ہی جنگلی زندہ بچے تھے
 میں نے اور لارڈ جان نے ان دیوزاد مینڈکوں پر گولیوں کی برچھاٹہ
 کر دی مگر ان پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ دراصل ان کا جسم بڑی

قدیم ساخت کا تھا یعنی جسم کا ہر خلیہ اپنی جگہ جان دار تھا اور جسم کے ایک حصے کا دوسرے سے اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا کہ پورے جسم پر ایک ہی کھال منڈھی ہوئی تھی۔

ہمارے گولی چلانے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان کی رفتار کم ہو گئی اور توجہ ہماری طرف بٹ گئی۔ اس سے ان پانچ چھ جنگلیوں کو بھاگ کر زینے تک پہنچ جانے کا موقع مل گیا۔ ہم بھی زینے پر پہنچ گئے۔

جہاں ہماری بیسیوں صدی کی بندوقیں کام نہیں آئیں وہاں جنگلیوں کے تیروں نے کام کر دکھایا۔ مگر زہر میں بچھے ہوئے ان تیروں کا اثر دیر میں ہوتا تھا۔ دونوں مینڈک اچھل اچھل کر اوپر چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کے بدن چھوٹے چھوٹے تیروں سے چھد گئے تھے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کوئی اثر نہیں ہوا مگر ٹھوڑی دیر بعد ایک کے گلے سے عجیب سے غراہٹ کی آواز نکلی پھر اس نے اپنا سر زمین پر ٹیک دیا۔ اس کے بعد دوسرے نے بھی ترپنا اور لوٹنا شروع کیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ٹھنڈے ہو گئے۔ جنگلیوں نے فتح کا نعرہ لگایا اور وہ نیچے اتر کر اپنے دشمنوں کی لاشوں کے گرد ناچنے لگے۔ رات کو انھوں نے لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور اٹھا کر دور جنگل میں پھینک آئے۔ یہ گوشت زہر بلا ہو چکا تھا اس لیے کھایا نہ جاسکتا تھا۔

یہ حالات میں گوشت کے ٹین پر کاغذ رکھ کر لکھ رہا ہوں۔ کبھی سکون کے ساتھ لکھنے کا موقع ملا تو اگلا قبیلے کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا اور میسل و ہائٹ لینڈ کے بارے میں بھی بتاؤں گا کہ گلیڈی جھیل کے پانی کی سطح چاندنی رات میں کس طرح چمکتی ہے۔

اس جھیل میں ایسے ایسے جانور ہیں کہ بعض کا تو ہمیں نام بھی نہیں معلوم۔ مثال کے طور پر ایک مچھلی ہے جو آدھی سیل کی طرح اور آدھی عام مچھلیوں کی طرح ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں کے گرد مضبوط ہڈی کے حلقے ہیں اور پیشانی پر ایک تیسری آنکھ بھی موجود ہے۔ یہ مچھلی ایک بار جال میں پھنس گئی تو ہماری کشتی اُلٹے اُلٹے بچی۔ اسی رات ہنر رنگ کا ایک سانپ پانی سے برآمد ہوا اور چلیخہ کی کشتی کے ملاح کو اپنی لپیٹ میں لے کر پانی میں غائب ہو گیا۔ عام طور سے یہ سانپ جھیل کے کنارے دلدل میں رہتا ہے اور جنگلی باشندے اس دلدل کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

اس سانپ کا پیٹ گائے سے زیادہ موٹا ہے اور اس میں سے مشک کی سی تیز خوش بو نکلتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے پرندے نے جو ٹیرڈ کمانل سے مختلف تھا، چلیخہ کا سچھا گیا اور اگر وہ چٹانوں میں نہ چھپ جاتے تو ان کی خیریت نہیں تھی۔ یہ پرندہ شتر مرغ سے اونچا تھا اور اس کی چونچ چیل کی طرح تیز و کیلی اور مڑی ہوئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے چلیخہ کے جوڑے کی ایڑھی اپنی چونچ

سے اس صفائی سے گتری جیسے بسولے سے انگ کی گئی ہو۔ اسی طرح ایک بار ہم نے دس فٹ لمبا سوڑا مارا جو چھیل کے کنارے پانی پی رہا تھا۔

یہ ساری باتیں میں پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا اور تباؤں گا کہ وہاں ہر موسم کا سن کس طرح نکھر جاتا ہے۔ بہار میں جنگل کے جنگل پھولوں سے ڈھک جاتے ہیں اور سارے علاقے میں خوش بو ہی خوش بو پھیل جاتی ہے، وہاں پھل اتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ دنیا کے اچھے سے اچھے پھل ان کے سامنے بے مزہ معلوم ہوں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ واپسی کے مشلے پر غور کرنے کے بجائے سیر و تفریح میں مصروف ہو گئے لیکن یہ بات نہیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک واپسی کے مشلے پر پوری توجہ دے رہا تھا لیکن کام یابی نہ ہو رہی تھی۔

ایک اور بات جو ہمیں معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جنگلی لوگ اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار نہ تھے۔ شاید ان کے ہاں یہ کوئی سخت قسم کا مذہبی حکم تھا کہ نہ خود باہر جاؤ نہ کسی کو باہر جانے کا راستہ بتاؤ۔ ویسے وہ ہمارے دوست تھے بلکہ انھیں بے دام غلام کنا غلط نہ ہوگا۔ لیکن جب ہم ان سے کہتے کہ ہمیں چمڑے کے اتنے لمبے لمبے رتے بنا دو جن کے سہارے ہم اتر جائیں تو وہ صاف انکا کر دیتے۔ خود بادشاہ کا بھی یہی رویہ تھا۔ البتہ ولی عہد کو، جس کی

جان ہم نے بچائی تھی، ہم سے ہمدردی تھی اور وہ اشاروں سے اس کا اظہار بھی کرتا تھا۔

جنگلیوں نے ہم سب کو ایک ایک غار دینے کی پیش کش بھی کی لیکن ہم مہذب دنیا کو چھوڑ کر یہاں آباد ہو جانے پر کس طرح تیار ہو جاتے۔ ان لوگوں کے یہ ارادے دیکھ کر ہم نے طے کر لیا کہ یہاں سے اپنی روانگی کے منصوبوں کو راز میں رکھیں گے ورنہ اگر انھیں علم ہو گیا تو وہ ہمارے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے سب کچھ کر گزریں گے۔ جانوروں کے خطرے کے باوجود میں اس دوران میں دو مرتبہ پورانے کیمپ گیا اور زمبوں سے باتیں کیں۔ زمبوں ہر بار مجھے یقین دلاتا کہ اب وہ مقامی باشندے ریتیاں وغیرہ لے کر ایک دو دن میں پہنچنے ہی والے ہیں۔

جب دوسری مرتبہ میں کیمپ سے واپس لوٹ رہا تھا تو ٹیروڈ کٹا کو کے غار کے پاس میں نے ایک بڑا سا پنجرہ دیکھا جو زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب قریب جا کر دیکھا تو اس کے اندر لارڈ جان تھے۔

”خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ذرا اپنے ٹیروڈ کٹائل دوستوں سے ملنے جا رہا تھا۔“ انھوں نے جواب دیا۔

”لیکن پیچھے میں کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ دیو زاد پرندے بڑے بے اخلاق ہیں۔ ہمانوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ پتھر ان کی چونچوں سے محفوظ رکھتا ہے۔“
لیکن ایسی دوستی کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ میں نے کہا۔
جواب میں لارڈ جان نے بتایا۔ دراصل پروفیسر جلیخیر ضد کر رہے ہیں کہ میں ان کے لیے ٹیروڈ کٹائل کا ایک بچہ پکڑ دوں۔
انہی کی خاطر یہ سوانگ رہنا پڑا ہے۔“

سمرلی جلیخیر کو برا بھلا کہا کرتے کہ وہ یہاں سے نکلنے کی ترکیب نہیں سوچ رہے ہیں۔ اس سے جو وقت ملتا وہ کیڑوں مکوڑوں کے نمونے جمع کرنے اور انہیں صاف اور خشک کر کے تھیلے میں بھرنے پر صرف کرتے۔

جلیخیر روز صبح کو کہیں چلے جلتے اور دوپہر یا تیسرے پہر کو واپس آتے تو ان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی ہوتی جیسی بھاری ذمہ داریوں سے نمٹنے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے اور پھر ایک دن وہ بھی اپنی تنقید لیبارٹری میں لے گئے۔

یہ لیبارٹری انہوں نے پام کے درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان بنا رکھی تھی۔ اس جھنڈ میں اُبلتے ہوئے پانی اور دلدل کا وہ چشمہ تھا جس میں سے گیس نکلتی تھی۔ اس کے کنارے ڈینوسار کی کھال سے کاٹ کر بناٹی ہوئی بہت سی ٹپیاں پڑی تھیں۔ وہیں ایک دیو زاد چھپکلی کے معدے کی اندرونی جھلی بھی تھی جسے بڑی صفائی

سے اتار کر خشک کر لیا گیا تھا۔ پروفیسر نے مضبوط کانٹوں کی مدد سے اسے سی کر بند کر لیا تھا اور صرف تھوڑا سا حصہ کھلا رکھا تھا۔ اس کھلے حصے میں انہوں نے کئی پتلے پتلے نرکل ٹھونس رکھے تھے۔ نرکل کے دوسرے سرے اُس دلدل میں گاڑ دیے تھے جس سے بلبوں کی شکل میں گیس خارج ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گیس اس عبارے میں بھرنے لگی۔ پروفیسر جلیخیر نے چمڑے کی ٹیلیوں سے اس عبارے کو چاروں طرف پام کے درختوں کی جڑوں سے باندھ دیا۔
کوئی آدھ گھنٹے میں اُس میں اتنی گیس بھر گئی کہ عبارہ اُپر اُٹھنے کے لیے زور لگانے لگا۔ جلیخیر فخر سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہم سب خاموش تھے۔ آخر سمرلی نے کہا۔

”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس میں لٹک کر یہاں سے نکل سکتے ہیں؟“
جلیخیر نے جواب دیا۔ ”میں تم پر یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عبارہ اتنا طاقتور ہے کہ ہم سب کا بوجھ سہا سکتا ہے۔“
”کیا تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو؟“ سمرلی نے غصے میں کہا۔
”میں اپنی جان اس طرح جو کھوں میں ہرگز نہ ڈالوں گا۔“

دونوں میں پھر ٹھن گئی لیکن حسبِ معمول لارڈ جان نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کرایا کہ بھنی دیکھیں تو، یہ عبارہ اُڑتا کیسے ہے؟ یہ کہہ کر انہوں نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”یار یہ پروفیسر ہے بلا کا فرین۔“

میں نے پردیس چلیجیر سے کہا۔ غبارہ تو آپ نے بنا لیا لیکن ہم بیٹھیں گے کہاں؟

چلیجیر نے جواب دیا۔ اصل مشکل غبارے کی تھی وہ تو میں نے بنا لیا۔ بید کا کھٹولا بنا لینا کیا مشکل ہے لیکن پہلے میں مسٹر سمرلی کو، چھپیں اپنی جان بہت پیاری ہے یہ دکھاؤں کہ میرا غبارہ کتنا بوجھ سہارا سکتا ہے۔

یہ کہہ کر چلیجیر ایک پتھر اٹھا لائے جو اتنا بڑا تھا کہ ان کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اسے نہ اٹھا سکتا تھا۔ انھوں نے پہلے سے چہرے کی پٹیوں کا ایک جال بنا رکھا تھا۔ یہ جال انھوں نے غبارے کے اوپر رکھا اور ان پٹیوں کے دوسرے سرے نیچے لاکر ڈیڑھ سو فٹ لمبی رستی جو ہمارے پاس تھی اس میں مضبوطی سے باندھ دی۔ اس رستی کے درمیانی حصے سے انھوں نے پتھر کو اچھی طرح کس دیا اور رستی کا آخری سر اپنی کلائی میں کٹی بل دے کر لپیٹ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب میں دکھاؤں کہ میرے غبارے میں کتنی طاقت ہے؟

یہ کہہ کر انھوں نے جلد جلد چہرے کی وہ پٹیاں چاقو سے کاٹ دیں جن سے یہ غبارہ پام کے درختوں کی جڑوں سے بندھا ہوا تھا۔ پھر جو ہوا اس کی ہمیں تو کیا خود چلیجیر کو بھی توقع نہ تھی۔ غبارہ تیزی سے اوپر اٹھا اور جب غبارے اور پتھر کے درمیان کی رستی تن گئی تو ایک

لحہ وہ ٹھہرا اور پھر پتھر بھی زمین سے اٹھتا چلا گیا۔ چلیجیر نے اپنے دونوں پس زمین میں اچھی طرح گاڑ دیے تاکہ اپنی کلائی کے زور سے اسے روکے رہیں لیکن ایک ہی جھٹکے میں ان کے پیر اکھڑ گئے اور وہ بھی ہوا میں ڈولنے لگے۔

میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ مسٹر چلیجیر کی کمر کے گرد ڈال کر انھیں پکڑ لیا مگر میں بھی ہوا میں بند ہو گیا۔ لارڈ جان نے میرے پیر پکڑ لیے مگر غبارے نے انھیں بھی زمین سے اٹھا لیا۔ میں تو ڈر گیا کہ خدا جانے ہم اسی طرح ایک دوسرے کے سہارے ٹکے ہوئے کہاں تک جائیں گے مگر خوش قسمتی سمجھیے کہ رستی ٹوٹ گئی۔ اس کے ٹپتے ہی ہم لوگ گر پڑے اور غبارہ تیزی سے اڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ ذرا پتھر اب تک اس میں لٹک رہا تھا۔

”دیکھا آپ نے؟“ چلیجیر نے فخر سے کہا۔ اس کے بعد بولے۔ آپ لوگ مطمئن رہیں۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر دوسرا غبارہ مع کھٹولے کے بناؤں گا اور ہم لوگ بڑے آرام اور حفاظت کے ساتھ اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائیں گے۔

سمرلی یہ سن کر کچھ بولے تو نہیں لیکن ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سفر کو خطرناک سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمیں اس خطرے میں پڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ وہاں صرف ایک ہستی ایسی تھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

آخر طے یہ پایا کہ اپنا سامان ہمیں چھوڑ کر پہلے ہم جا کر غار کا جائزہ لیں۔ اس جنگل میں ایک خشک لکڑی ہوتی تھی جس میں شاید تیل کا کوئی جڑ تھا اور یہ خوب جلتی تھی۔ جنگلی اُس کی مشعلیں استعمال کرتے تھے۔ ہم نے بھی اُس لکڑی کے کچھ ٹکڑے اکٹھے کیے اور اس غار کے اندر داخل ہو گئے۔ ہمارے اندر پتھرتے ہی بڑی بڑی چمگادڑیں جو غار کی چھت میں لٹکی ہوئی تھیں شور کرتی ہوئی باہر کی طرف لپکیں۔

ہمیں ڈر تھا کہ جنگلیوں کو روشنی دیکھ کر شبہ نہ ہو جائے اس لیے غار کے اندر کافی دور ہم اندھیرے میں ٹوٹ ٹوٹ کر بڑھے اور جب ہم دو تین موڑ مڑ گئے اور یہ اطمینان ہو گیا کہ اب روشنی باہر نہیں جائے گی تب ہم نے مشعلیں جلا لیں۔ یہ بالکل خشک ترنگ تھی۔ دیواریں ہموار تھیں اور ان پر جنگلیوں کی بناٹی ہوئی تصویریں تھیں۔ فرش پر سفید چمک دار ریت بھی ہوئی تھی۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے لیکن آگے جا کر یہ راستہ بند ہو گیا۔

ہمارے دل جھج گئے اور ہم بڑی دیر چپ چاپ کھڑے رہے راستہ پتھروں یا مٹی کے ڈھیر سے بند نہیں ہوا تھا بلکہ ایک باقاعدہ دیوار سامنے آگئی تھی جو اس کا ثبوت تھا کہ ہمیشہ سے یہ اسی طرح ہے۔

چلیں نے سینہ ٹھونک کر کہا: فکر مت کرو دوستو، میں اب بھی

تجربہ بنانے کا ذمہ لیتا ہوں۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا غبارہ“ سمرلی نے دانت پس کر کہا
 ”کیسے ہم غلط غار میں تو نہیں چلے آئے؟“ میں نے خیال ظاہر کیا لیکن
 لارڈ جان نقشہ ساتھ لائے تھے۔ آنکھوں نے اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔
 اپنے آپ کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ۔ صاف اسی غار پر نشان
 لگا ہوا ہے۔ دائیں طرف سے سترھواں اور بائیں جانب سے دوسرا۔
 میں نے نقشے کو غور سے دیکھا اور میری سمجھ میں ایک بات آگئی۔
 نقشے میں اس غار کو دو شاخہ دکھایا گیا تھا۔ شروع میں کافی دیر ہم
 اندھیرے میں چلے تھے اور دائیں طرف مڑ گئے تھے حالانکہ اصل میں ہمیں
 بائیں طرف جانا تھا۔ یہی حصہ زیادہ لمبا دکھایا گیا تھا۔

میں نے یہ بات دوسروں کو بتائی تو آنکھوں نے میرے خیال کی تصدیق کی اور پھر ہم واپس چلے۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ کوئی تیس گز
 چلنے کے بعد ہمیں ایک دو شاخہ ملا۔ اس بار ہم بائیں طرف واپس
 ترنگ میں داخل ہوئے۔ یہ زیادہ کشادہ تھی اور اس کی چھت بھی اونچی
 تھی۔ کئی سو گز چلنے کے بعد کچھ فاصلے پر لال لال روشنی سی دکھائی
 دی۔ پہلے تو ہم ڈر کر رک گئے لیکن پھر احتیاط سے آہستہ آہستہ آگے
 بڑھے۔ ذرا اور قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا سا گول سوراخ
 ہے جس میں سے روشنی کی کرنیں اندر آ رہی ہیں اور فرش پر پڑی ہوئی
 ریت چاندی کے ذروں کی طرح چمک رہی ہے۔

سب سے پہلے لارڈ جان سوراخ کے پاس گئے اور پھر لیکا ایک وہ چلائے۔ چاند۔ یہ چاند ہے۔ ہم نے ٹرننگ کا دوسرا سرا پایا ہے۔

ہم سب لیکا کو سوراخ کے پاس پہنچے۔ سامنے پورا چاند چمک رہا تھا۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو زمین زیادہ دور نہیں تھی۔ یہاں سے نیچے پہنچانے کے لیے ہماری رسی کافی تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد ہم واپس آگئے اور غار سے باہر نکلنے سے بہت پہلے اپنی شعلیں بجھا دیں تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اب ہمیں صرف اپنا سامان سمیٹنا تھا۔ اگلی رات کو یہاں سے نکل جانے کی بات چکی ہو چکی تھی۔

ہم نے اپنی روانگی کی تیاریاں اس احتیاط سے کیں کہ جنگلیوں کو ذرا شبہ نہیں ہوا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ بند دوتوں اور کارٹوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہ لے جائیں گے۔ لیکن چیلنجر اڑ گئے کہ ان کا سامان ضرور جانے گا اور ان کے سامان میں ایک بکس بھی تھا جس کے بارے میں میں ابھی نہیں بتاؤں گا کہ اس میں کیا کیا تھا۔ یہ بکس اتنا وزنی تھا کہ اُس نے ہمیں تھکا مارا۔ ہم اپنے ساتھ دو مضبوط بانس لائے تھے۔ ٹرننگ کے باہر کے سرے سے بلا کہ ہم نے ان بانسوں کو ایک چوکڑی کی شکل میں زمین میں مضبوطی سے گاڑا اور ان میں رستی باندھ دی۔ جس کے سہارے ایک ایک کر کے سب

لوگ اتر گئے۔ چیلنجر کا سامان بھی اسی میں باندھ کر اتارا گیا اور آخر میں وہ خود اتر آئے۔

اپنی دنیا میں واپس پہنچ کر ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ ہم نے کئی بار ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور مبارک باد دی۔ اس کے بعد ہم زمو کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے لیکن جب رات کے آخری حصے میں ہم وہاں پہنچے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہاں ایک کے بدلے کئی الاڈجل رہے ہیں۔ امدادی جماعت رتیاں اور دوسرا سامان لے کر پہنچ گئی تھی۔ گویا ہمیں یہ نفعیہ راستہ نہ ملتا تب بھی دوسرے دن ہم نیچے اتر سکتے تھے۔

یہاں پہنچ کر میں اپنی رپورٹ ختم کرتا ہوں۔ آج ہم واپس روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ آخری قسط میں پارا پیچ کر ڈاک میں ڈال دوں گا۔

رکھا گیا تھا لیکن زولو جیکل ہال چھوٹا پارٹ گیا۔ اس لیے جلسے کا انتظام
کوئنٹر ہال میں کیا گیا۔ ہم 6 نومبر کو لندن پہنچے تھے گویا دوسرے
ہی دن یہ جلسہ بلا لیا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس جلسے کی روداد آپ کو کیسے
سناؤں اور کہاں سے سناؤں۔ بہتر یہ ہے کہ میں اپنے اخبار کے
8 نومبر کے شمارے سے اس جلسے کی روداد ہی لکھ دوں۔ رپورٹ
کی سترخیاں ہیں۔

نئی دنیا کی دریافت

کوئنٹر ہال میں عظیم الشان جلسہ

جلسے میں ہنگامہ۔ ریجنٹ سٹریٹ میں فساد

(ہمارے خاص رپورٹر کے قلم سے)

پروفیسر چلیخبر نے دعویٰ کیا تھا کہ پرانے زمانے کے جانور آج بھی
دنیا میں موجود ہیں۔ ان کے اس دعوے کی تصدیق کے لیے پچھلے سال
ادارہ حیوانیات نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے پروفیسر چلیخبر کی گمشدہ
دنیا کا سفر کیا اور آج رات کوئنٹر ہال میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

یہ جلسہ سائنس کی تاریخ کا ایک یادگار جلسہ تھا اس لیے کہ وہاں
پر موجود لوگوں نے جو کچھ سنا اور دیکھا اسے وہ زندگی بھر نہ بھول سکیں گے۔
جلسے میں شرکت کے ٹکٹ صرف ممبروں اور ان کے دوستوں کے لیے
مخصوص تھے لیکن زیادہ سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے کسی نہ کسی

واپسی

واپسی میں برازیل کی حکومت کے افسروں اور مقامی لوگوں کی طرف
سے ہمیں جو مدد ملی اس کے لیے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔
پہلے قصبے میں منیچن کے بعد انھوں نے ہمارے لیے کپڑوں کا بندوبست
کر دیا اور ہم ایک مرتبہ پھر مہذب انسان نظر آنے لگے۔

ابھی ہم جہاز میں ہی تھے کہ مختلف اخباروں کے تار پرتا آنے
لگے کہ ہم اپنا سفر نامہ ان کے ہاتھ فروخت کر دیں لیکن جیسا کہ پہلے
سے طے تھا یہ سفر نامہ میرے اخبار کے لیے وقف تھا اور اسے بھی
اس کی اجازت نہیں تھی کہ ادارہ حیوانیات کے ممبروں کے سامنے مسئلہ
پیش ہونے سے پہلے کوئی قسط چھاپی جائے۔

جب ہمارا جہاز ساؤتھمپٹن کی بندرگاہ پر پہنچا تو اخباری نمائندوں
کی ایک فوج کی فوج ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی لیکن ہم طے
کر چکے تھے کہ وقت سے پہلے زبان نہ کھولیں گے اس لیے وہ صرف
ہماری تصویریں ہی کیمنج کر رہ گئے۔ ادارہ حیوانیات کا جلسہ 7 نومبر کو

طرح ٹکٹ حاصل کر لیے۔ جلسے کا وقت اگرچہ آٹھ بجے شب کا تھا لیکن اس سے بہت پہلے ہی نہ صرف ساری نشستیں بھر گئی تھیں بلکہ بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

جن لوگوں کو اندجانے کا موقع نہ ملا انھوں نے باہر لوٹ پھوٹ شروع کر دی اور اچھا خاصا بلوہ ہو گیا جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں ایچ ڈوئرن کے انسپکٹر اسکول بھی شامل ہیں جن کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگ ہلا کر کے بے ٹکٹ اندر گھس گئے۔

جلسے میں شرکت کے لیے نہ صرف برطانیہ کے تمام ممتاز سائنس دان آئے تھے بلکہ فرانس، جرمنی اور سویڈن تک کے سائنس دان وہاں موجود تھے۔ گم شدہ دنیا کے سفر سے آنے والے چاروں آدمی جب وہاں پہنچے تو لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ چاروں کے چاروں بڑے ہتاشاش تھے اور سفر کی سختیوں کا ان پر کوئی اثر نظر نہ آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کا رنگ ذرا کالا ہو گیا تھا۔

جلسے کی صدارت ڈیوک آف ڈرہم کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف سے مٹر سمرلی رپورٹ پیش کریں گے میں ان کے اودا آپ کے درمیان زیادہ دیر جامل رہنا نہیں چاہتا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ان لوگوں کا سفر کامیاب رہا ہے اور اس دنیا میں اب بھی ایسے عجوبے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ جب مٹر سمرلی بولنے کھڑے ہوئے تو پہلے سے زیادہ شور اور ہنگامہ

ہوا۔ ہم ان کی تقریر الگ شائع کریں گے۔ مختصراً یہ کہ انھوں نے پہلے اپنے سفر کا مقصد بیان کیا اور پھر اپنے دوست پروفیسر چیلنجر سے معافی چاہی اس لیے کہ ان کے دعوے کو غلط کہنے والوں میں مٹر سمرلی بھی شامل تھے۔

مٹر سمرلی نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح میسل وہائیٹ لینڈ پہنچے اور وہاں کیسے کیسے حیرت ناک جانور دیکھنے میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ قدیم زمانے کے جن جانوروں کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات ہیں وہ تو وہاں زندہ موجود تھے ہی لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے جانور بھی تھے جن کے بارے میں سائنس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ ہم نے وہاں گہرے گہرے رنگ کا ایک سانپ دیکھا جو 50 فٹ لمبا تھا۔ ایک اور جانور دیکھا جو اپنے پنجوں کو دودھ پلاتا تھا اور رات کو جگنو کی طرح چمکتا تھا۔ اسی طرح ایک بڑا کالے رنگ کا بھونرا بھی وہاں ہوتا ہے۔ مقامی جنگلیوں کے کہنے کے مطابق اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ مختلف قسم کے ڈینوسار اور میٹرڈکٹائل پرندوں کی تعداد وہاں بہت ہے۔ مٹر میلون نے تو وہ جانور بھی دیکھا ہے جس کا خاکہ پروفیسر چیلنجر نے میسل وہائیٹ کی خاکوں کی کتاب میں دکھایا تھا۔ مٹر سمرلی نے ہاتھی سے بھی بڑے نول خوار مینڈکوں کے بارے میں بھی بتایا۔ پھر انھوں نے بن مانسوں کا ذکر کیا کہ وہ باقاعدہ بستی بسا کر اور جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے اور ڈنڈوں اور پتھروں سے لڑتے تھے۔

غرض مسٹر سمرلی نے بڑی تفصیل سے ساری باتیں بتائیں۔ اس کے بعد مبارک باد کی تجویز پیش ہوئی۔ سوڈن کے سائٹس دان اس کی تائید کے لیے کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر النگ نے اٹھ کر کہا۔

جناب صدر میں صرف وہی بات کہہ رہا ہوں جو خود مسٹر سمرلی نے پچھلے جلسے میں کہی تھی۔ آخر ہمیں کیسے یقین آئے کہ یہ لوگ کوئی گھڑی ہوئی کہانی نہیں بنا رہے ہیں؟ مسٹر سمرلی کے پاس اپنے دعوے کا ثبوت کیا ہے؟

اس تقریر پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ بہت سے لوگ ڈاکٹر النگ ورتھ کے حامی ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے: جناب صدر بات بہن اتنی ہے کہ پہلے ایک آدمی جھوٹ بول رہا تھا اب چار آدمی وہی جھوٹ دہرا رہے ہیں۔ آخر ہم بغیر کسی ثبوت کے اسے سچ کیسے مان لیں؟

جمعے قابو ہوا جا رہا تھا۔ ڈیلوک آف ڈرہم امن وامان قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر النگ ورتھ نے ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی۔

جناب صدر، میری تجویز یہ ہے کہ مسٹر سمرلی کا شکریہ تو ادا کر دیا جائے لیکن اس کا اعلان کر دیا جائے کہ پروفیسر چیلنجر کے دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اور پھر تصدیق کے لیے ایک بڑی اور قابلِ اعتماد کمیٹی مقرر کی جائے۔

جمع بہت شور مچا رہا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کہ یکایک مکمل خاموشی چھا گئی۔ پروفیسر چیلنجر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”آپ لوگوں میں سے جو لوگ پچھلے جلسے میں موجود تھے انہیں یاد ہوگا کہ اس قسم کی بدتمیزی کا مظاہرہ اس وقت بھی کیا گیا تھا۔ اس وقت سب سے زیادہ اعتراض مسٹر سمرلی کو تھا لیکن اب حقیقت ان پر عیاں ہو چکی ہے لہذا وہ میری تصدیق کر رہے ہیں۔“

آج کے جلسے میں سب سے زیادہ اعتراض ان صاحب کو ہے جو ابھی ابھی تقریر کر کے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ ان کے اعتراض کا جواب دینے کے لیے مجھے اپنی اعلیٰ ذہنی سطح سے بہت نیچا آنا پڑے گا اس کے باوجود میں اس کے لیے تیار ہوں تاکہ آپ میں سے جس کسی کے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ دور ہو جائے۔“

اس پر لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ پروفیسر چیلنجر نے کچھ دیر روکنے کے بعد پھر تقریر شروع کی۔

”مسٹر سمرلی نئی نئی قسم کے جو کھڑے مکوڑے اکٹھے کر کے لاٹے ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ۔“

ڈاکٹر النگ ورتھ نے بات کاٹ کر کہا۔ ان سے کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ کھڑے مکوڑے تو کہیں سے بھی لاٹے جاسکتے ہیں۔“

چیلنجر نے کہا: اچھا، اگر آپ لوگ کھڑے مکوڑوں سے قائل نہیں

ہوتے تو میں دیو زاد پرندے ٹیروڈ کٹائل کی عادتوں کے بارے میں آپ کو بتاؤں۔ دیکھیے میرے پاس یہ کتاب ہے اس میں ٹیروڈ کٹائل کی تصویر ہے۔

”تصویر سے کام نہیں چلے گا۔“ ڈاکٹر النگ درتھ نے کہا۔

”تم تو ہٹ دھرم ہو۔ تمہیں اگر زندہ ٹیروڈ کٹائل بھی دکھایا جائے تب بھی تم نہیں مانو گے۔“

”کیوں نہیں مانوں گا؟ ضرور مانوں گا۔“

”سچ کہتے ہو؟“

”ہاں ہاں بھلا زندہ ٹیروڈ کٹائل دیکھ کر کون انکار کرے گا۔“

ڈاکٹر النگ درتھ کا خیال تھا کہ انہوں نے پالا مار لیا ہے لیکن چلیخبر بھی کچی گویاں نہیں کھیلے تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر سٹیج کے پچھلے دروازے سے ہلے ہوئے کمرے میں گئے اور فوراً ہی واپس آگئے۔ ان کے ساتھ ایک طاقت ور حبشی ملازم تھا اور دونوں ایک بکس اٹھائے ہوئے تھے۔ بکس لا کر انہوں نے سٹیج پر رکھ دیا اور چلیخبر اس کا کھسنے والا ڈھکنا کھول کر کہنے لگے۔

”چلو۔ نکلو باہر۔ شاباش۔“

لوگ اچک اچک کر دیکھنے لگے کہ اتنے بڑے بکس میں کیا ہے اور ان کے دیکھنے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا اور انتہائی مکروہ صورت پرندہ پر پھٹ پھٹاتا اور شور کرتا بکس سے نکل کر اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس کی مہرچ آ نکھیں

انگاریوں کی طرح چمک رہی تھیں اور خوفناک لمبی چوہنچ میں سفید سفید زونیلے دانتوں کی لمبی قطار دُور سے نظر آ رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ عورتیں خوف سے چیخنے لگیں۔ اور دو عورتیں تو بے ہوش ہو گئیں۔ پر ذہن سر چلیخبر ہاتھ ہلا کر مجمع کو سکون سے رہنے کی تلقین کرنے لگے لیکن اُن کا ہاتھ ہلانا غضب ہو گیا۔ دیو زاد پرندہ بھڑک گیا اچانک اُس نے اپنے پس فٹ لمبے پر کھولے اور ایک جست بھر کر ہال میں چکر لگانے لگا۔ بغیر روئیں دار چمڑے کے پر بجلی کی روشنی میں اور بھی بھیانک نظر آ رہے تھے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ گرتے پڑتے سب بھاگنے لگے۔ کئی آدمی کچلے گئے۔

ہال کی پچھلی دیوار کے اوپر کے حصے میں، چھت کے پاس، ایک بہت بڑا روشندان تھا۔ چلیخبر چیخے: ”روشندان بند کر دو۔ بند کر دو۔“ مگر وہاں سننے کا ہوش کسے تھا۔ دیو زاد پرندہ اڑتا اڑتا روشندان کے پاس آیا اور دونوں پر سمیٹ کر اس میں سے نکل گیا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد لوگوں کو ہوش آیا۔ بھاگنے والے پلٹ پڑے۔ انہوں نے چاروں ہیروؤں کو کندھوں پر اٹھایا اور جلوس کی شکل میں لے چلے۔ لندن کی ساری سڑکوں پر جلوس نے گشت لگایا۔ کوئی ایک لاکھ لوگ اس میں شریک تھے۔ سارے شہر میں ٹریفک رگ گیا۔ پولیس بھی لوگوں کے جوش و خروش کے سامنے بے بس تھی۔ آخر آدھی رات کے بعد جب لوگ تھک گئے تب کہیں جا کر

اتھوں نے ان لوگوں کو چھوڑا۔

یہ تو تھی اس جلسے کی رپورٹ۔ اب اس ٹیروڈ کٹائل کا قصہ سنئے جو پروفیسر چیلنجر سے بے وفائی کر کے ہمیشہ کے لیے اُن کے دل پر داغ چھوڑ گیا۔ دو عورتوں نے گواہی دی کہ ہال سے نکل کر وہ پرندہ چھت پر بیٹھ گیا اور کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ دوسرے دن شام کے اخباروں میں خبر تھی کہ مالبورو ہاؤس پر پیرا دینے والے ایک فوجی جوان کا کورٹ مارشل کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ پیرا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس بے چارے فوجی نے اپنی صفائی میں بتایا کہ میں نے ہوا میں ایک شیطان اُڑتا ہوا دیکھا تھا۔ وہ میرے اوپر چاند کے درمیان آ گیا جس سے چاند بالکل چھپ گیا۔ یہ دیکھ کر میں اتنا ڈرا کہ بندوق چھوڑ کر بھاگ گیا۔

بھارتی نوس میں ہالینڈ کے ایک جہاز کے کپتان نے اپنی کتاب میں لکھا کہ صبح نو بجے ایک بہت بڑا پرندہ جہاز پر سے اُڑتا ہوا گزرا۔ اُس کا جسم بکری جیسا اور پر چمکا ڈر کے سے تھے۔ اُسے جنوب مغرب کی طرف اڑتے دیکھا گیا۔

تو گویا آخری گواہی کے مطابق چیلنجر کا یہ چیتا پرندہ اپنے وطن کی طرف اُڑ رہا تھا۔ خدا جانے وہ وہاں پہنچا یا ہزاروں میل کے سفر کے درمیان ہی تھک کر سمندر میں گرا اور ختم ہو گیا۔

بچوں کے لیے دل چاہنے والی ناول

عالی پر کیا گزری؟	2.50	قزاقوں کی وادی	2.50	ٹارزن
پناکو کے کارنامے	2.50	شہزادین اور دشمن درندے	2.50	ٹارزن کی واپسی
سلیم کی آپ بیتی	2.25	قیدی	2.50	ٹارزن اور درندے
محمد پر کیا بیتی	1.25	مزیح کا حملہ	2.50	ٹارزن کا بیٹا
خزانے کا راز	2.50	یونے اور دیو	2.50	بادشاہ کا خواب
ایک بچہ، ایک چور	2.50	گرہ کٹ	2.50	پراسرار جزیرہ
گوریلا	1.50	نگس	2.50	توشیرواں کی بیٹی
پانچ لاکھ	2.50	اندھیرا غار	2.50	امیر حمزہ میدان جنگ میں
سکندر بن کاغزانہ	2.50	خون کی ہولی	2.50	امیر حمزہ کوہ قاف میں
پچھنگو میاں کے کارنامے	2.50	چاندی کے چور	1.75	کالا جزیرہ
ویران محل	1.50	کشمیر کی بیٹی	2.00	لورا
رابن کروسو	2.50	دو تہیم	2.50	منجوس قلعہ
دشمن کی سازش	2.00	نجم کی سرگزشت	2.50	چاند پر پہلا آدمی
شہزادین کی واپسی	2.00	بارہ بھائی	2.00	دنیا کا سفر
سلیمانی خزانہ	1.75	وہ کیا راز تھا؟	2.00	پراسرار آبدوز
نیلا طوطا	2.50	بھوت بنگلہ	2.50	ہاتھی دانت کے چور
سرکس کا ہاتھی	2.00	غیبی انسان	3.00	دولت پور میں
ایک ٹانگ کا آدمی	2.50	میرا نام منگو ہے	4.25	کیا وہ خواب تھا؟
کالاناگ	1.50	شہزادین محاذ جنگ پر	2.50	خونی جزیرہ

پشاور
کراچی

راولپنڈی
حیدرآباد

لاہور
منگلہ

ناپوسٹل

● سعید رضا سعید

معروف صحافی، اردو شاعر و ادیب، افسانہ و ناول نگار، مترجم شعبہ خبر ریڈیو پاکستان کراچی۔

سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ ہندوستان بمبئی

ناول ایک کہانی۔ تین عورتیں ایک مرد

خاوند منور سلطانہ (شاعرہ وادیہ)

ولادت جولائی ۱۹۲۹ء، اجیر

وفات ۲۱ جولائی ۱۹۹۵ء، لاس انجلس (امریکہ)

ماخذ پک م س۔ سومشہور شعراء جلد ۸

تدفین موضع موہال ضلع جبلم

ماخذ نونشاہی شعراء

سعید ہالائی (ڈاکٹر محمد سعید ابرو)

سندھی شاعر، تلمیذ انور ہالائی

ولدیت قاضی عبدالحی سلیم

ولادت ۱۸ دسمبر ۱۹۳۵ء، ہال

وفات ۱۸ مئی ۱۹۸۵ء، ہال

تدفین ہال ضلع حیدرآباد

ماخذ ڈرنایاب عرف یاد و رفتگان

سعیدہ احسن

اردو ادیبہ، افسانہ نگار۔ مدیر ماہنامہ 'تول' لاہور۔ رسالہ

'قدیل' لاہور میں 'ساحرہ' کے قلمی نام سے افسانے لکھتی

رہیں۔ اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے قلم سے کام لیا۔

کتب شہرت کا شوق۔ عید کا جوڑا۔

ساحرہ کے افسانے (۲۰۰۷ء)

دختر مولانا ظفر اقبال مرحوم

وفات ۲۳ دسمبر ۲۰۰۶ء، لاہور

سعید شیخ

معروف اردو شاعر و ادیب۔

بانی مدیر ماہنامہ 'علامت' لاہور (اجراء ۱۹۸۹ء)۔

۱۹۸۲ء میں بطور ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل ریٹائر ہوئے۔

ولادت ۱۹۲۲ء

وفات ۷ دسمبر ۲۰۰۴ء، لاہور

تدفین لاہور

ماخذ نوائے وقت لاہور ۱۸ دسمبر ۲۰۰۴ء

معقول جمالیاتی
لہذا اور کا پس منظر لفظ لہذا

وفیاتِ اہلِ قلم

رخصت ہو جانے والے پاکستانی اہلِ قلم کے کوائف اور تواریخ و وفات
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تا ۱۴ اگست ۲۰۰۷ء



ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج

اکادمی ادبیات پاکستان



سعید رضا سعید

ساحر چلا گیا۔ سحر باقی ہے

لوگ کہتے ہیں نام کا شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کے تخاص سحر نے انہیں الفاظ اور جذبات نگاری کی جادوگری سکھائی اور ایک مسحور کن شخصیت عطا کر دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان شخصیت نے اس لفظ کو نئے ہمہ گیر معنی دینے۔ اس سے پہلے ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ساحر کہتے کسے ہیں۔

پھر تیلو جیم، لمبا قد۔ اگر کرکٹ کی دنیا میں آجاتا تو فاسٹ بالر بن کر ابھرتا۔ اختلاط ہوتا تو چار سو میٹر کا ریکارڈ اسی کا ہوتا۔ جس علاقے کا وہ سنے والا تھا وہاں پولیس میں بھرتی کرنے والی ٹیم فیسٹ نے امیدواروں کے قدم ناپتی پھرتی تھی۔ فوراً لے لیا جاتا اور چونکہ بڑھا لکھا بھی تھا اس لئے ایس۔ پی ہو کر ریٹائرڈ ہوتا۔ لیکن وہ بڑا نکما رکلا۔ شاعری جیسی فنشول علت میں پڑ گیا اور مزید خرابی یہ کہ کمیونسٹ بن گیا۔ ساحر کے باشعور ہونے کا زمانہ وہ تھا جب دوسری جنگ عظیم نئی نئی ختم ہوئی تھی اور اگر خاندان کا کوئی راکا امن کی ایبل پر دستخط کر دیتا تو رشتے دار اور قریبی عزیز پر سادینے اور نصیر کی تاقین کرتے کے لٹے آیا کرتے تھے۔

ہندوستان پر برطانیہ کی عملداری تھی۔ جنگ میں ہونے کے سوویت یونین بھی اتحادیوں کا حلیف

شروع شروع میں ناکامیاں ہوئیں۔ ایک آدھ چانس مل جاتا تو پیسے نہیں ملتے۔ ساحر نے بہت سخت دن گزارے۔ لیکن حالات کی سختیاں اس دبے پتلے نوجوان کو توڑ نہیں سکیں۔ اور پھر برت ٹوٹی۔ ساحر کے گریٹ ہندوستان کے چونی کے گلوکاروں کی آواز میں گلی گلی گونجنے لگے۔ اس وقت تک فلمی گانوں کے ریکارڈوں پر فلم، گلوکار اور موسیقار کا نام ہوتا تھا۔ شاعر کا نام مینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ پہلے کسی شاعر کو یہ مطالبہ کئے کی جرات ہوتی تھی۔ ساحر نے اپنے معاہدے میں یہ شرط لکھوانا شروع کی۔ شاعر کا نام ریکارڈوں پر بھی آنے لگا اور ریڈیو پر گانے سے پہلے اعلان میں بھی شاعر کا نام دیا جانے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم انڈسٹری میں شاعروں کو باعزت مقام دلوانے کا سہرا ساحر کے ماتحت ہے۔

ساحر کمٹنٹ کے شاعر تھے کمٹنٹ کے شاعر ہونے کے دعوے دار تو اور لوگ بھی ہیں لیکن ساحر وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے کبھی اپنے عہد سے دعا نہیں کی۔ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کسی فلم ساز کو یہ جرات نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان سے اپنا لہجہ بدلنے کو کہے۔ ساحر نے زندگی میں جتنا بھی کلام کہا اس کا بیشتر حصہ فلم میں لے لیا گیا۔ بہت طویل نظموں کے بھی بعض حصے فلموں میں آئے۔ فی گانا انہوں نے جو معاوضہ لیا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔

ساحر کی زندگی میں یوں تو بے شمار گانے مقبولیت کا بلند ترین افاق پار کر گئے لیکن رمیش سہگل کی فلم ”پھر صبح ہوگی“ کا تحسیم سا ننگ۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

دنیا بھر کے مظلوموں کا ترجمان اور ایک حیثیت سے محنت کشوں کا ترانہ بن کر جاوید موسیٰ گیا۔ رمیش سہگل ترقی پسند تھے۔ ساحر کو لینے کے لئے انہیں اپنے پارٹنر سے لڑائی لڑنی پڑی اور ایک غیر معروف میوزک ڈائریکٹر کو لے لیا۔ پنجاب کے دو مسلمان لڑکے میوزک ڈائریکٹر بننے کے شوق میں آئے تھے۔ اس زمانے میں یہ رواج چل پڑتا تھا کہ دو آدمی مل کر میوزک دیتے تھے چنانچہ حسن لال بھگت رام کا طوطی بول رہا تھا۔ ان لڑکوں نے ’ورما جی شرما جی‘ کے نام سے کوشش شروع کی۔ فلمسٹار نرگس کے سہانی کی ایک فلم میں انہیں چانس بھی ملا لیکن فلم ہر لحاظ سے کمزور رہی اور ورما جی شرما جی چمک نہ سکے۔

مسلسل ناکامیوں اور فاقوں سے گھبرا کر ورما جی تو واپس لاہور آگئے لیکن شرما جی نے جدوجہد جاری رکھی۔ رمیش سہگل نے اپنی فلم ”پھر صبح ہوگی“ کی موسیقی شرما جی کو دی اور ان کا نیا نام ’نیام‘ بھی خود ہی تجویز کیا۔ اس فلم کے گانے ہبٹ ہوئے اور نیام راتوں رات نوازد چنکر اور دوسرے بڑے موسیقاروں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس فلم نے ساحر کے مقام کو بھی بے مثل استقام بخشنا۔

اقبال کے مشہور ترانے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔

کی پیر و ٹکی ساحر نے ایسی لکھی کہ پیر و ٹکی کی صنعت میں اسے ہمیشہ کے لئے ایک منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ نیام نے اس کی بیون بھی ایسی بنائی کہ اسے کورس میں آسانی سے گایا جاسکتا تھا اور آج تک یہ ہندوستان میں بے روزگار اور بے گھر نوجوانوں کے ترانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساحر نے لکھا۔

چین و عرب ہمارا ہے ہندوستان ہمارا

تھنا بلکہ پوری جنگ کا آہٹے سے زیادہ دباؤ خود برداشت کر رہا تھا اس لئے اس کے خلاف سرکاری پالیسی میں قدرے نرمی ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو چھوٹ ملی۔ ساری دنیا میں یہ ایک اصول ہے کہ جتنے بھی زیادہ اچھے ادیب اور شاعر ہوتے ہیں ان کی بڑی اکثریت ترقی پسند بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ سچا فن کار حساس اور ایماندار ہوتا ہے۔ وہ منگولوں کا دکھ درد محسوس کرنے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر انسان کی فطرت کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا خاصا بڑا حصہ اچھے ادب میں شامل ہے، لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت میں لکھی جانے والی ایک بھی تحریر آج تک اچھے ادب میں شامل نہ ہو سکی۔

ہندوستان کا سرمایہ دار درپردہ فاسٹی مجوری طاقتوں کا حامی تھا۔ یہ لوگ ہٹلر کو اپنے نجات دہندہ کے بطور دیکھتے تھے اور ہندوستان میں جسے پرکاش نرائن کی سوشلسٹ پارٹی اور سبھاش چندر بوس کی بھی یہی پالیسی تھی۔ ہٹلر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جہاں پرکاش نرائن نے پورے ہندوستان میں دہشت گردی شروع کر دی اور سبھاش چندر بوس نے جاپانیوں کی سرپرستی میں آزاد ہند فوج بنالی۔ لیکن ترقی پسندوں نے اسے حب الوطنی کی جنگ عظیم قرار دیا۔ دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست سوویت یونین کا کامیاب دفاع انسانیت اور حق و انصاف کی بقا کا مسئلہ بن گیا تھا۔

ہندوستان کے ترقی پسند بھی اپنا فرض بڑے خلوص سے نبھا رہے تھے۔ تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں بیشتر اسی طرف آجاتے تھے۔ ساحر بھی پنجاب سے چلے، دہلی میں ٹھہر کا لیتے ہوئے بمبئی آ گئے۔ بمبئی ہندوستان کا سیاسی مرکز تھا۔ باری بڑی سیاسی جماعتوں کے ہیڈ کوارٹرز بمبئی ہی میں تھے۔ بمبئی کا ریس بڑا طاقت ور تھا۔ یہاں فلم انڈسٹری بھی موجود تھی جو ابلاغ کا بہت موثر ذریعہ تھا۔

جگر صاحب جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آتے تھے، اپنے کسی ہونہار شاگرد کو ساتھ لاتے اور فلم انڈسٹری میں متعارف کرا کے چلے جایا کرتے تھے۔ تشکیل مراد آبادی اور مجروح سلطان پوری کو بھی جگر صاحب نے دریافت کیا تھا اور انہوں نے پرانے حصے ہوئے شاعروں مدھوک، امر جلال آبادی وغیرہ کی فضیلوں میں رچنے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔

ساحر بمبئی آئے تو انہیں جگر صاحب جیسی کسی بیساکھی کا۔ بہارا نصیب نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی پتلی پتلی ٹانگوں پر چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ فلم انڈسٹری سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی۔ تشکیل انہیں سوٹ کرتے تھے۔ مجروح، ہوشیار آدمی تھے۔ باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیاسی مشاعروں میں آتے تو یہ پڑھ کر داد سمیٹتے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر

لوگ ساتھ آتے گئے تھے کارواں بنتا گیا۔

اور فلموں میں اس قسم کے گیت لکھ کر پیسے سمیٹتے۔

نخر لاگی لاجہ تور سے بنگلے پر۔

لیکن اس قسم کی سمجھوتے بازی ساحر کی فطرت کے خلاف تھی۔ کمیونسٹ ہونے کا لیبل ان پر لگ چکا تھا اس لئے کہ انہوں نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور مارواڑی اور گجراتی فلم پروڈیوسر اس لفظ سے ایسے بدکتے تھے جیسے لال کپڑے سے میل۔

رہنے کو گھر نہیں ہے ، سارا جہاں ہمارا
جتنی بھی یاد تھیں تھیں سہنوں نے بانٹ لی ہیں
سڑکوں پر پھر رہا ہے اب کارواں ہمارا ۔

ان کی نظم :-
شناخو ان نقابیں مشرق کہاں ہیں :-
ایک مقبول فلمی گانا ثابت ہوا حالانکہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی زبان بہت مشکل ہے۔
کسی دوسرے فلمی شاعر کو اتنی ثقیل زبان استعمال کرنے کی حیرت کبھی نہیں ہوئی لیکن یہ نظم وہ
پہلے کہہ چکے تھے۔ فلم کے لئے بعد میں اس کا انتخاب کیا گیا۔
ساحر بہت کاتے تھے اور بہت خرچ کرتے تھے۔ تار دیو پران کا ہنگامہ ان ترقی پسند
ادیبوں اور شاعروں کے لئے سہراٹے بنا رہتا تھا جو فلم میں قسمت آزمائی کے لئے بمبئی کا
رخ کرتے تھے۔ ماں جی (ساحر کی والدہ) ہر ایک کا خیال رکھتیں۔ کوئی بیمار ہوتا تو جاگ کر اس
اس کی تیمارداری کرتیں۔ مادانہ شفقت کا جو خزانہ ان کے پاس تھا وہ خالی ہونے کا نام نہ
لیتا تھا۔

بڑے سیاسی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لئے ساحر حیب وغیرہ کر لیتے تو
ایسا کبھی نہ ہوتا کہ لوگوں کو مایوس کریں۔ وہ اسٹیج کے شاعر نہ تھے یعنی پڑھنے کا انداز ڈرامائی
نہ تھا لیکن لوگ بڑی توجہ سے انہیں سنتے۔ کالجوں کی لڑکیاں اور لڑکے تو ان کے دیوانے تھے۔
ان کا مجموعہ تلخیاں ہندی میں بعد میں شائع ہوا لیکن اردو کا مجموعہ بھی ایسے طالب علموں نے خرید لیا
جو اردو پڑھ نہیں سکتے تھے اور کسی دوست سے پڑھوا کر سنتے تھے۔

ساحر ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور کم سخن تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے تنہائی
پسند تھے۔ شرمیلے تھے۔ انہیں زندگی میں سب کچھ حاصل ہوا، دولت، شہرت، مکیبولیت
اور محبت۔ لیکن بد قسمتی سے وہ شادی نہ کر سکے۔ ان کے نام سے کئی رومان منسوب ہوئے۔
ایک مشہور گلوکارہ اور ایک مشہور ادیبہ اور شاعرہ کے نام سر فرہست ہیں لیکن کوئی رومان
پروان نہ چرھ سکا۔ ماں جی کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔

ساحر کے کردار کا سب سے بڑا کرشمہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ دراصل
وہ اتنا پیارا آدمی تھا کہ کوئی زیادہ دنوں تک اس سے ندامت نہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سلسلے
میں میرا ذاتی واقعہ ہے۔

میں روزنامہ ہندوستان بمبئی کا چیف ایڈیٹر ہونے کے علاوہ ایک ذاتی پرچہ "ہفتہ وار بمبئی"
بھی نکالتا تھا جو روزنامے کے سائز پر اور اسی انداز میں شائع ہوتا تھا۔ یہاں پرچہ میرا ذاتی پرچہ
تھا لیکن پڑھنے والے اسے پارٹی آرگن تصور کرتے تھے۔ یہ پرچہ اتوار کو ہندی سے شائع ہوتا
تھا میں اس کی خبروں والی کاپی کی پیشینگی کر دیتا تھا۔ دل بہت ملول تھا اس لئے کہ اسٹالن
کی وفات کی خبر آچکی تھی۔ میں نے حتی الامکان اس موضوع پر خاصہ میٹر بھی دیا تھا کہ کئی اعظمی
دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اعلان کر دو کہ اگلا شمارہ "اسٹالن نمبر" ہوگا۔ صفحے بھی زیادہ
ہوں گے اور اس میں ہم سب لکھیں گے۔ عام آدمیوں کے علاوہ ہم لوگ اپنی ڈر کر بھی اسے
سڑکوں پر فروخت کریں گے۔

میں نے کہا کہ اس میں لکھے گا کون۔ تم لوگوں کے دعوے میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔
کیشی نے پورا یقین دلایا بلکہ خود اعلان لکھ کر دے دیا جس میں حسب ذیل نام شامل تھے :-

ڈاکٹر شہنشاہ، حشمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، سجاد
احمد عباس، ساحر لہریا، قوی، سردار عیضی، کیشی اعظمی، وغیرہ وغیرہ :-

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

میں احتجاج کرتا رہ گیا لیکن کیفیت نے اعلان کا تہ کو دے کر دو کالمی جو کھٹا لکھوایا اور ذمہ داری لی کہ وہ خود سب سے بات کر چکے ہیں اور سب کی تحریریں فراہم کر رہے گئے۔ اور ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ مجروح نے اپنی مطبوعہ کتاب میں سے ایک غزل دے دی اور ایک نظم کیفیت اپنی دے گئے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

لیکن میں تو اپنے قارئین کے سامنے جواب دہ تھا۔ میں نے دو اہم ترین ناموں یعنی کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے نام سے اسٹالن کی وفات پر خود مضمون لکھے اور چھاپ دیئے۔ نہ صرف یہ کہ کسی نے بھی محسوس نہیں کیا بلکہ بعد میں کرشن اور عصمت دونوں نے ان مضامین کی تعریف بھی کی اور کسی نے بھی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ جن لوگوں نے مجھے 'لٹ ڈاؤن' کیا تھا ان سے مجھے بجا طور پر ناراضگی تھی۔ بھیم شری (کبھی کے قریب جھٹ) کے مشاعرے میں ساحر ملے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، آکر لپٹ گئے اور اس خلوص کے ساتھ 'یار سوری' کہا کہ میرے دل کا سارا بخار نکل گیا۔ واقعی ساحر سے کوئی روٹھا ہوا نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ جانے پھر کبوں ایسا پیارا شخص ہم سب سے روٹھ کر چلا گیا؟

